Monthly AWAMI JAMHURIAT

عوامی جمہوریت

ماہنامہ دسمبر 2017

اشاعت کا
49واں سال

2017

سرمایہ دارانہ بربریت اور فوجی غلبے کا ایک اور سال

تم وحشی ہو تم قاتل ہو

حبیب جالبؔ

ناموس کے جھوٹے رکھوالو
بے جرم ستم کرنے والو
کیا سیرت نبوی جانتے ہو
کیا دین کو سمجھا ہے تم نے
کیا یاد بھی ہے پیغام نبیؐ
کیا نبی کی بات بھی مانتے ہو
یوں جانیں لو، یوں ظلم کرو
کیا یہ قرآن میں آیا تھا؟
اس رحمت عالم نے تم کو
کیا یہ اسلام سکھایا تھا
لاشوں پر پتھر برسانا
کیا یہ ایمان کا حصہ ہے
الزام لگاؤ مار بھی دو
دامن سے مٹی جھاڑ بھی دو
مسلمان بھی کہلاؤ اور پھر
ماؤں کی گود اجاڑ بھی دو
تم سے نہ کوئی سوال کرے
نہ ظلم کو جرم خیال کرے

اس دیس میں جو بھی جب چاہے
لاشوں کو یوں پامال کرے
لیکن تم اتنا یاد رکھو
وہ وقت بھی آنا ہے
ہے جس کے نام پر ظلم کیا
اس ذات کے آگے جانا ہے
اس خونِ ناحق کو پھر وہ
میزانِ حشر میں تولے گا
وہ سرورِ عالم محسن جاںؐ
تم سے اتنا تو بولیں گے
اے ظلم و جبر کے متوالو
تم حق کے نام پہ باطل ہو
تم وحشی ہو تم قاتل ہو

عوامی ورکرز پارٹی بلوچستان کی جانب سے بیت المقدس کے حوالے سے ٹرمپ کے فیصلے کے خلاف مظاہرہ

کامریڈ ذاکر حسین کی عوامی ورکرز پارٹی میں شمولیت کے موقع پر AWP برطانیہ کے رہنماؤں کے ساتھ گروپ فوٹو

ہاری پورھیت کمیٹی ضلع سانگھڑ کا اجلاس

کراچی میں AWP اور مزدور کسان پارٹی کے وفود کی ملاقات

لاپتہ افراد کی بازیابی کیلیے سندھ پروگریسو کمیٹی کی جانب سے کراچی پریس کلب پر بھوک ہڑتال

حسن ناصر شہید کی یاد میں کراچی میں منعقدہ تقریب کے شرکاءاور مقررین

سویت سوشلسٹ انقلاب کی سد سالہ سالگرہ کی مناسبت سے نوشہرہ میں منعقدہ تقریب

سویت سوشلسٹ انقلاب کی سد سالہ سالگرہ کی مناسبت سے بادھ میں منعقدہ تقریب

عوامی ورکرز پارٹی KPK اور کاشتکار تنظیم سوات کے مشترکہ لانگ مارچ سے کامریڈ فانوس گجر کا خطاب

شمارہ نمبر۔09
جلد نمبر۔13
MONTHLAY
AWAMI JAMHURIAT
LAHORE
ماھنامہ
عوامی جمہوریت
لاھور
CPL No 279
دسمبر2017
قیمت:30روپے

ایڈیٹر
اختر حسین
مجلس ادارت
عابد حسن منٹو
مسلم شمیم' صباالدین صبا' توقیر چغتائی'
عابد شکیل فاروقی
مینجنگ ایڈیٹر
اے آر عارف
سرکولیشن منیجر
اشتیاق اعظمی

اداریہ		1
پروفیسر یوسف حسن کا انٹرویو:		3
عابد حسن منٹو کا انٹرویو:	عارف میاں	8
گنے کی کاشت	اثر امام	17
نیپال میں کمیونسٹوں...	فاروق طارق	19
دنیا کی پہلی اشتراکی...	صالحہ اطہر	21
جمہوریت اور فوج	ڈاکٹر توصیف احمد	24
بھٹہ مالکان نے...	اصغر شاہین	26
وفاقی کمیٹی کے فیصلے		27
بائیں بازو کا متحدہ محاذ		28
ایک نظر	رپورٹ: عابد شکیل فاروقی	31

لاہور آفس 5 میکلوڈ روڈ لاہور' پاکستان
فون 042-37353309-37357091
فیکس 94-42-36361531
کراچی آفس: 201-204 پینوراما سینٹر نمبر 1 فاطمہ جناح روڈ صدر کراچی
Email:awami.jamhuriat@gmail.com

اداریہ

سرمایہ دارانہ بربریت اور فوجی غلبے کا ایک اور سال

سال 2017 پاکستان میں معاشی ترقی اور جمہوریت کے بارے میں تجزیہ کرنے کے لئے کسی گہری تحقیق یا مطالعے کی ضرورت نہیں کیونکہ جب ہمارے حکمران طبقات کی سیاسی پارٹیاں خواہ اقتدار میں ہوں یا حزب اختلاف میں ان کے پروگرام یا سیاسی عمل میں عوام کی معاشی و سماجی حالت بدلنے پر کوئی کمٹمنٹ ہی نہ ہو، تو کیا تبدیلی آسکتی ہے۔ ہماری دیہی معیشت و سیاست میں وہی جاگیرداروں، بڑے زمینداروں کا غلبہ ہے اور پیداوار کے آلات بدلنے کے باوجود، ہاری، کسان کھیت مزدور، اسی غربت، جہالت اور پسماندگی میں زندگی گزار رہے ہیں بلکہ پہلے بھی سے بھی زیادہ بھوک' ننگ اور افلاس کا شکار ہیں، حکمرانوں کے پاس بنیادی زرعی اصلاحات تو کجا، سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے بھی زراعت اور زرعی ترقی کے بارے کوئی پالیسی ہی نہیں ہے، کبھی گندم، چاول حتیٰ کہ سبزیاں اگانے والوں کو بحران کا سامنا ہے اور کبھی گنے کے کاشتکاروں کو۔ صنعتی وتجارتی پالیسی کی ناکامی کے نتائج تو اس سے بھی ظاہر ہو رہے ہیں کہ روپے کی قدر ڈالر کے مقابلے میں کم ہوئی ہے، شرح نمو اور برآمدات 2016 کے مقابلے میں بھی 2017 میں کم ہوئی ہیں۔ پاکستان کی برآمدات 22 ارب ڈالر تک بھی نہیں جبکہ سنگاپور جیسے ملک جس کی آبادی چالیس لاکھ ہے اور قدرتی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں مگر اس کی برآمدات 516 ارب ڈالر ہیں۔ ویت نام کی 160 ارب ڈالر، اور بنگلہ دیش کی 38 ارب ڈالر ہیں۔ ہم اب بھی آئی۔ ایم۔ ایف کے نسخوں پر چل رہے ہیں جو ہم کو نجکاری کرو، ٹیکس کی بنیاد وسیع کرو، روپے کی قیمت کرو، کے سرمن دیتے ہیں۔ بیروزگاری پہلے سے بھی بڑھی ہے شریف حکمران صرف موٹروے اور سڑکیں دکھاتے ہیں، وہ CPEC کی ترقی کے مژدے تو سناتے ہیں مگر معیشت کا ماڈل چین ہی کا اختیار کرنے کی بجائے امریکہ اور یورپ کا اپناتے ہیں جو خود انحطاط کا شکار ہے۔

معیشت میں سرمایہ دارانہ بربریت کے ساتھ جمہوریت اور جمہورے ادارے مزید فوجی

اسٹیبلیشمنٹ کے غلبے میں ہیں، عدلیہ کا کردار نظریہ ضرورت کے اثر سے ابھی بھی نہیں نکلا اور مذہبی انتہا پسندی، دہشت گردی، عدم برداشت، وہابیوں اور سلفیوں سے گزر کر بریلویوں تک پہنچ گئی ہے، دھرنے خواہ کھلے بالوں کے ساتھ ناچ گانے والوں کے ہوں یا پگڑیاں باندھ کر مادر زاد گالیاں دینے والوں کے، پہلے ان کے پیچھے اور اب ان کے ساتھ فوجی رقم تقسیم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، مقصد ملکی معیشت و سیاست کو اپنے کنٹرول میں رکھنا ہے تاکہ خارجہ پالیسی بھی اپنی مرضی کی تشکیل دیں۔ بس سال میں ترقی یہ ہوئی ہے کہ اب عوام کو ان سیاست دانوں اور ان کے پس پشت قوتوں اور ان کے کرداروں پہچاننے میں دیر نہیں لگتی۔

ٹرمپ بیانیہ اور پاک امریکہ تعلقات

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے حالیہ پالیسی بیان میں کہا ہے کہ پاکستان ایک طرف اربوں ڈالر امداد لیتا ہے اور دوسری طرف افغانستان میں ہمارے خلاف جنگ لڑنے والوں کی مدد کرتا ہے۔ ٹرمپ نے پاکستان کو کھلے طور پر جھوٹا، دوغلا اور دغاباز کہا ہے اور امداد بند کرنے کی دھمکی دی ہے۔ اس کے بعد اقوام متحدہ میں امریکی سفیر نکی ہیلی نے بھی پاکستان پر ڈبل گیم کا الزام لگایا ہے اس کے بعد دو ارب ڈالر کی فوجی امداد بند کر دینے کا اعلان کر دیا گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہماری قومی سلامتی کمیٹی کے اجلاس کے بعد جو بیان جاری کیا گیا وہ معذرت خواہانہ اور نیم دروں نیم بروں کے علاوہ کچھ نہ تھا اور ہمارے آئی۔ ایس۔ پی۔ آر کے جنرل صاحب نے صاف کہا کہ امریکہ اب بھی ہمارا دوست ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کام وہی کریں گے بس ذرا ہماری قربانیوں کی قبولیت کا اظہار کر دیں۔ امریکہ اور ہمارے حکمران گزشتہ پندرہ سالوں 2002 تا 2017 کے دوران امداد کا حساب کتاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے ملکی مفاد میں دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑی ہے، لیکن اس سے قبل، بیس سالوں 1979 سے 1999 تک سوویت افواج اور افغان انقلاب کے خلاف جنگ اور 1990 تا 2001 طالبان کی پشت پناہی کس نے کی، اب یہ راز نہیں رہا کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے پوری دنیا سے مذہبی انتہا پسندوں کو جمع کیا اور ان کو جنگجو بنایا، پاکستان نے ان کی تربیت کی اور افغان انقلاب و روس اور دراصل سوشلزم کے خلاف جنگ اور پاکستان کے اندر ہزاروں مدرسوں کی صورت میں ان کی تربیت گاہیں بنائیں، یہ سب کیا پاکستان کے مفاد میں تھا یا ہم نے امریکہ اور مغرب کی غلامی کی۔ بلکہ اس سے بھی پیچھے کیوں نہیں جاتے 1954 سے سیٹو اور سینٹو کے ہم اتحادی رہے جو معاہدے پاکستان کے دفاع کے لئے نہیں بلکہ کمیونزم کے خلاف تھے، 1965 اور 1971 کی پاک بھارت جنگوں میں ہماری کسی اتحادی نے مدد نہیں کی، پاکستان آدھا رہ گیا، ہم اسلامی دنیا کی بات کرتے ہیں، افغانستان کے بعد امریکہ نے عراق اور لیبیا کو تباہ کیا، کیا وہاں جمہوریت لائی گئی، پھر شام میں کون وہاں کی حکومت کے خلاف جنگجوؤں کی مدد کر رہا ہے۔ یمن اور پوری عرب دنیا کی تباہی کے پیچھے کیا امریکہ کا ہی ہاتھ نہیں ہے، پھر بھی ہمارے اصل حکمران کہتے ہیں کہ امریکہ ہمارا دوست ہے، اس دوستی سے مکمل طور پر نکلنے کا وقت آ گیا ہے مگر ہمیں سنجیدگی سے پہلے اپنی متبادل پالیسی بنانے کی ضرورت ہے اور وہ پالیسی دوستی اور امن کی ہے، خاص کر پڑوسی ملکوں سے دوستی، تنازعات کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ چین کے وزیر اعظم نے پاکستان کے دورے پر کہا تھا کہ ''چین نے اپنی ترقی کے لئے خارجہ پالیسی میں دو اصول اپنائے ایک یہ کہ دور کے رشتہ دار سے پڑوسی اچھا ہوتا ہے اور دوسرا ترقی کے لئے تنازعات کو قالین کے نیچے ڈال دو۔'' سمجھ لیں کہ ایٹم بم ہمارا تحفظ نہیں کر سکتا، مضبوط معیشت اور جمہوری بالادستی ہی دفاع کر سکتے ہیں، ہمیں ماضی کی ذہنیت کو بدلنے کی ضرورت ہے، اپنی پالیسیاں مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ عقلیت اور دنیاویت پسندی کی بنیاد پر تشکیل دینی ہوں گی۔ یہی ٹرمپ کے بیانیے کا جواب ہے۔

بائیں بازو کا اتحاد

پاکستان میں رائج جاگیردارانہ سیاست' سرمایہ درانہ بربریت' جمہوری اداروں پر فوجی بالادستی' بین الاقوامی طور پر سامراجی غلبے اور ہمارے حکمران طبقات کی سیاسی پارٹیوں کی عوام کے حقیقی معاشی و سماجی مسائل کے بارے کسی کمٹمنٹ کے بغیر انتہائی موقع پرستی کی وجہ سے عوام جائز طور پر اس ملک کی ترقی پسندوں اور بائیں بازو کی قوتوں سے ہی توقع کرتے ہیں کہ وہ کوئی متبادل معیشت دیں گے اور سیاسی رہنمائی کریں گے جس سے ملک کے پورے عوام کو ان کے بنیادی معاشی اور سماجی حقوق مل سکیں جن میں تعلیم' روزگار' صحت' علاج معالجے اور رہنے کی چھت کے حقوق یعنی زندگی کے بنیادی حقوق شامل ہیں۔ لہٰذا بائیں بازو اور ترقی پسند قوم پرست آٹھ سیاسی پارٹیوں جن میں عوامی ورکرز پارٹی' پاکستان مزدور کسان پارٹی' کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان' ٹریڈ یونینز ڈیفنس کمپین' مزدور محاذ' عوامی جمہوری پارٹی' جئے سندھ محاذ (جونیجو) اور جموں کشمیر عوامی ورکرز پارٹی شامل ہیں لاہور میں 29 دسمبر 2017ء کو اپنے ایک اجلاس میں مشترکہ اعلامیہ جاری کیا اور ایک متحدہ محاذ تشکیل دینے پر اتفاق کیا جس کا نام اور پروگرام بعد میں تفصیلی اجلاس میں طے کیا جائے گا (ہم اعلامیہ الگ سے شائع کر رہے ہیں) ادارہ عوامی جمہوریت اس اعلامیہ کو خوش آئند سمجھتا ہے اور امید کرتے ہیں کہ بائیں بازو کا یہ اتحاد محنت کار عوام کی خواہشات پر پورا اترے گا۔ 2017ء کی سیاست میں یہی ایک خوش آئند قدم ہے۔

مارکس مذہب اور مغالطے

پروفیسر یوسف حسن
ترتیب وتدوین: عابد شکیل فاروقی

استاد محترم یوسف حسن کا تعلق خطہء پوٹھوہار سے ہے وہ معروف مارکسی دانشور ہیں اور عوامی ورکرز پارٹی کے بنیادی اراکین میں سے ہیں ''مارکس مذہب اور مغالطے'' کے موضوع پر انکا ایک طویل انٹرویو روزنامہ ایکسپریس میں شائع ہوا تھا جو کئی فکری مغالطے دور کرتا ہے، عوامی جمہوریت، ایکسپریس کے شکریئے کے ساتھ آج اس انٹرویو کو اپنے قارئین کے لئے شائع کر رہا ہے۔

ترقی پسندی کا بنیادی مسئلہ آخر ہے کیا؟

ترقی پسندی کا بنیادی مسئلہ سماجی زندگی کے سارے شعبوں میں ایسی تبدیلی اور ارتقاء ہے جس سے ہر فرد کی جسمانی، روحانی، اور ذہنی صلاحیتوں کی آزادانہ اور مسلسل نشو ونماء ہوتی رہے۔ اس نصب العین کے حصول کے طریقہء کار میں سماجی پیداواری عمل اور سماجی طبقاتی جدوجہد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ لینن کے مطابق اسکا میتھڈ اور موٹو چار لفظوں میں Enlightement through Class struggle بنتا ہے۔

ہمارے ہاں اس پر ہوا کام، تسلی بخش ہے؟

پاکستان میں دانشورانہ یا علمی ترقی پسندی کچھ کمزور رہی ہے۔ علمی ترقی پسندی کا کام زیادہ تر درمیانہ طبقے کے تعلیم یافتہ افراد کو کرنا ہوتا ہے اس میں بہت سخت مقام آتے ہیں لہذا یہ تبھی کیا جا سکتا ہے جب محنت کش عوام سے محبت گہری ہو، یہ محبت قیام پاکستان سے پہلے کے ترقی پسند دانشوروں میں زیادہ تھی اور اسی نسل نے علمی ترقی پسندی کے مختلف شعبوں میں کچھ کام بھی کئے لیکن یہ کام نئی نسلوں کی نظریاتی تعلیم وتربیت کے لئے کافی نہیں ایک تو اس کی مقدار کم ہے دوسرے اس کا معیار بھی تسلی بخش نہیں۔

ذرا معیار والی بات کی وضاحت کر دیجئے!

ہمارے بزرگ ترقی پسند دانشوروں نے سماجی تنقیدی عمل کو بنیاد بنا کر لکھنے کی بجائے زیادہ تر ''تحریک روشن خیالی'' کی ''عقلیت پسندی'' اور اسکے دوسرے تصورات کے زیر اثر رہ کر علمی کام کیا اور وہ بھی عموما عالمی سائنسی سماجی ترقی پسندی کے بنیادی ماخذوں کا براہ راست مطالعہ کئے بغیر، یہ کام سیاسی معیشت تک محدود ہے سماجی زندگی کئی پہلو رکھنے والا کمپلیکس ہے، ہمیں نفسیات، بشریات، عمرانیات، تاریخیات، آثاریات، وغیرہ جیسے شعبوں میں بھی ترقی پسندانہ علم کی ضرورت ہے کیونکہ ترقی پسندی پورے انسان کی آزادانہ نشو ونماء کے لئے جدوجہد ہے۔

مذہب کے ساتھ ترقی پسندی کا کوئی قضیہ بنتا ہے؟

بالکل بھی نہیں ! مذہب اور خاص طور پر اسلام ہمارے لئے نہایت حساس معاملہ ہے مارکس اور اینگلز اسلام کے ظہور کے اسباب اور کردار کو سمجھنے میں بڑے سنجیدہ تھے وہ اسے محمدی ﷺ انقلاب Muhammadan Religious Revolution تسلیم کرتے تھے اور اسلام کے مختلف پہلوؤں پر آپس میں خط و کتابت بھی کرتے رہے مگر حیرت ہے کہ ہمارے اکثر ترقی پسند اسلامی عقائد، شخصیات اور مسلمان اقوام کی تواریخ کے مطالعے ہی سے بے نیاز ہیں۔ یہ ایک علمی المیہ ہے کہ ہمارے پاس پاکستان کے قدیم وجدید سماج کی تاریخ کے سائنسی مطالعے پر مبنی مواد موجود ہی نہیں اور خاص طور پر ابتدائی صدیوں کی اسلامی تاریخ کا بھی کوئی حقیقت پسندانہ معروضی تجزیہ نہیں کیا گیا۔ جب ہمارا دعویٰ ہی سماجی تاریخ کو اپنے عوام کے حق میں تبدیل کرنے کا ہے تو پھر پاکستان اور مسلمانوں کی سماجی تاریخ سے یہ لاتعلقی کیوں؟ سماجی نصب العین کو سامنے رکھا جائے تو اشتراکی تحریک کا اسلام سمیت کسی بھی مذہب سے براہ راست کوئی تصادم نہیں۔ اس سلسلے میں مارکس اور اینگلز کا لکھا ہوا کمیونسٹ مینی فیسٹو بنیادی دستاویز ہے، جس میں کسی بھی مذہب کے خلاف ایک سطر بھی نہیں کرسچیئن سوشلزم کی مخالفت اس کے کرسچیئن ہونے کی وجہ سے نہیں کی گئی بلکہ اس کے غیر مجاہدانہ ہونے کی وجہ سے کی گئی روس کا معروف انارکسٹ باکونن پہلی کمیونسٹ انٹرنیشنل میں ''ملحد سوشلسٹوں کے سیکشن'' کی حیثیت سے رکنیت چاہتا تھا لیکن مارکس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ورکروں کو

مومنوں اور ملحدوں میں مت تقسیم کرو۔

اور وہ افیون؟

افیون والا فقرہ مارکس کے 1844 کے مسودات میں آیا ہے جب ابھی پختہ مارکسزم کی تشکیل نہیں ہوئی تھی، اس نے بعد کی تحریروں میں اس بات کو کبھی نہیں دہرایا اور جو لوگ خصوصاً ہمارے روشن خیال عقلیت پسند، جو مذہب پر تنقید کو طبقاتی جدوجہد پر ترجیح دیتے ہیں انکے بارے میں مارکس نے ''سرمایہ'' کی پہلی جلد کے ایک فٹ نوٹ میں لکھا ہے، کہ تجزیہ کر کے یہ دکھانا بڑا آسان ہے کہ کون سے آسمانی مظاہر کی بنیاد کون سے زمینی مظاہر میں ہے لیکن واحد سائنسی طریقہ یہ ہے کہ یہ دکھایا جائے کہ سماجی رشتے کن processes سے گزر کر آسمانی مظاہر میں تبدیل ہوجاتے ہیں، میرے خیال میں جو شخص یہ سائنسی طریقہ استعمال کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اسے پہلے طریقے سے بھی دور ہی رہنا چاہئے۔ ترقی پسندوں کے لئے بنیادی تقسیم روشن خیالوں اور قدامت پسندوں کے درمیان نہیں، ظالموں اور مظلوموں کے درمیان ہے، مظلوم قدامت پسند ہے یا روشن خیال، اس سے زیادہ اہم اسے ظالموں کے خلاف متحدہ طبقاتی جدوجہد میں لانا ہے اور لینن نے تو واضح ہدایت کی تھی کہ خطبوں اور پمفلٹوں کے ذریعے روشن خیالی مت پھیلاؤ، لوگوں کو طبقاتی جدوجہد میں لاکر روشن خیال بننے دو۔

سوشلسٹ، کمیونسٹ سماج میں فرد کی انفرادیت کے سوال پر اکثر ترقی پسند بدک جاتے ہیں؟

یہ حقیقت تلخ اور المناک ہے کہ اردو اور ہماری دوسری پاکستانی زبانوں میں فرد، اسکی ذات، انفرادیت، یکتائی، شناخت، اور آزادانہ نشو ونما کی اہمیت اور ضرورت کے موضوع پر فلسفیانہ، عمرانیاتی، اور نفسیاتی کسی بھی علمی حوالے سے کوئی سائنسی مواد موجود نہیں اور المیے پر المیہ یہ کہ خود ترقی پسندوں کو بھی اس کمی کا احساس نہیں سو نتیجہ یہ کہ فرد کے مسئلے پر باہمی مکالمہ ہی دشوار ہوجاتا ہے، ایک دوسرے سے بات کرنے میں بھی دقت اور سمجھنے میں بھی۔

سید علی عباس جلال پوری ہمارے ایک بڑے ترقی پسند روشن فکر مفکر ہیں، بارہ کتابیں ہیں انکی، کسی میں بھی فرد کی نظریہ سازی کے بارے میں بات نہیں، ہمارے عزیز حامد مدنی ایک بلند پایہ شاعر تو ہیں ہی اس کے ساتھ واقعی ایک عالم ادبی نقاد بھی ہیں لیکن فیض احمد فیض کے دفاع میں لکھی اپنی کتاب میں فرد کے مسئلے پر لکھتے ہیں کہ اس وقت فرد کا مسئلہ اتنا اہم تھا ہی نہیں، انکے اس جواز پر حیرت ہوتی ہے کیونکہ اقبال اپنے خطبات اور شاعری میں خاص طور پر ''اسرار و رموز خودی'' میں خودی یا ذات کی نظریہ سازی کر چکے تھے جسکا بنیادی موضوع فرد ہی تھا پھر یہ کہ خود مارکس، فرد کے حوالے سے بنیادی نظریہ سازی 1845 میں کر چکا تھا، جسکے مختلف پہلو وہ بار بار اپنی مختلف تصانیف میں سامنے لاتا رہا مگر ہمارے ترقی پسند دانشوروں، ادبی نقادوں اور ادیبوں نے بھی فرد کی نظریہ سازی پر سائنسی تحقیق جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ سوویت یونین میں جتنا اعلیٰ کام نفسیات اور فلسفے پر ہوا اس سے بھی ہمارے ترقی پسند اب تک بے خبر ہیں۔

سوویت ماہرین نفسیات اور فلسفیوں نے فرد کے بارے میں مارکس کے فلسفیانہ تعقلات کو علمی تحقیقات اور تجربات کی روشنی میں زیادہ نکھار کر پیش کیا اور بتایا کہ سماجی پیداواری عمل میں کس طرح حیوانی فرد، انسانی فرد میں تبدیل ہوجاتا ہے، اور جوں جوں جدید ذرائع پیداوار کی ترقی ہوتی ہے انسان فطرت کے غلبے کے علاوہ محدود خاندانی اور قبائلی رشتوں سے بھی آزاد ہوتا جاتا ہے اور اسکی انفرادیت کے نکھرنے اور نشو ونما پانے کے امکانات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ سرمایہ داری میں افراد کے نشو ونما کے یہ رشتے، زر کے واسطے کے محتاج ہوتے ہیں لیکن یہی زر کے رشتے فرد کو آفاقیت بھی عطا کرتے ہیں۔

مارکس کا ایک دلچسپ فقرہ ہے کہ جسکی جیب میں زر ہے گویا سارے سماجی رشتے اسکی جیب میں ہیں جبکہ زیادہ سے زیادہ سماجی رشتوں کو ذات میں جذب کرنے ہی سے فرد کی ذات ثروت مند اور یکتا ہوتی ہے۔ ترقی پسندوں کا حقیقی نصب العین زر کی غلامی ختم کر کے فرد کی ہمہ جہت نشو ونما ہے۔ میں نے 2007 میں جناب احمد ندیم قاسمی کی برسی پر لاہور میں منعقدہ جلسے میں اپنی گفتگو میں کہا تھا کہ ساٹھ کی دہائی کے جدیدیت پسندوں نے فرد کی ذات کے انکشاف و اثبات وغیرہ کا سوال بجا اٹھایا تھا لیکن ترقی پسندوں نے کبھی اسکا معقول جواب نہیں دیا، خود جدیدیت پسندوں نے فرد کی ذات کو Given یا پہلے سے عطا شدہ لے لیا، یہ کبھی سوچا ہی نہیں کہ اثبات ذات سے تشکیل ذات کیونکر ہوتی ہے۔

سوویت یونین اور فرانس میں مارکسی ماہرین نفسیات نے فرد کی شخصیت اور

ذات کی تشکیل کے موضوع پر جتنا اعلیٰ کام کیا ہے ہمارے پاکستانی ترقی پسندوں کو نہ تب اسکی خبر تھی اور نہ اب ہے اور اب تو پہلے سے کہیں بہتر علمی اضافے ہو چکے ہیں۔ یہ بہرحال زیادہ فلسفیانہ بحث میں پڑے بغیر ہمارے لئے فی الحال قابل فہم نکتہ یہ ہے کہ سماجی عمل انسان کے انسان میں ڈھلنے کی اصل بنیاد ہے، سوشلائزیشن جتنی بڑھتی ہے انفرادیت بھی اتنی ہی بڑھتی ہے۔ حقیقی ترقی پسندانہ تعلیمات کی رو سے فرد کی انفرادیت کا اثبات اور نشو ونما ہمارے بنیادی نصب العین کا مرکزی نقطہ ہے، جہاں تک ادب کا تعلق ہے تو انفرادیت کے بغیر کوئی سچا ادب پارہ ہو ہی نہیں سکتا۔

اسٹالن کو اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں کم تر، تھوڑا احمق اور خاصا سفاک دکھایا جاتا ہے؟

ایک گروہ نے اسٹالن کو غیر مشروط پر مسترد کرنے کا رویہ اپنا رکھا ہے، یہ مسئلہ اتنا سیدھا سادہ نہیں میں اس سلسلے میں امریکی مارکسی مفکر، جے سن ڈبلیو اسمتھ کے اس تجزیئے سے متفق ہوں کہ پسماندہ سماجوں کو ترقی یافتہ سوشلزم کی طرف جانے کے لیے اسٹالنسٹ سوشلزم 'لازمی مرحلہ' ہے۔ صنعتی بنیاد کی تعمیر وتوسیع کے بغیر محض نیک جذبات وخیالات سے سوشلسٹ سماج نہیں بنایا جا سکتا۔ لینن اور اسٹالن اس ضرورت کو سمجھتے تھے لیکن ٹراٹسکی اس کی اہمیت سے بے خبر تھا وہ پسماندہ سماج میں ترقی یافتہ سوشلزم کا نفاذ فی الفور چاہتا تھا۔

بالشویک ورکر تو ویسے بھی ٹراٹسکی کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے لینن اور اس کے مابین بنیادی اختلاف 1921 میں پیدا ہو چکے تھے، عبوری دور میں 'بیوروکریسی' سے کام لینا بھی ضروری ہوتا ہے اور اس کے خطرات سے آگاہ رہنا بھی۔ اسٹالن کی موت کے بعد سوویت بیوروکریسی خاص طور پر غالب آ گئی اور سرکاری سوشلسٹ معیشت کے متوازی زیر زمین سرمایہ دارانہ معیشت بھی پھلنے لگی جس نے آخرکار سوشلسٹ نظام کو برباد کر دیا۔ اس معاملے میں چین اور کچھ دوسرے سوشلسٹ ملکوں کی یہ پالیسی درست ہے کہ انہوں نے محدود سرمایہ داری بحال کر کے سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والوں کو ننگا کر دیا اور صنعتی بنیاد کی توسیع کا عمل شروع کیا کیونکہ اس کے بغیر سوشلسٹ سماجی نفسیات پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ سماجی شعور کا تعین سماجی وجود سے ہوتا ہے تو سماجی وجود میں مرکزی حیثیت طرز پیداوار کو حاصل ہے۔

تو سوویت یونین کے انہدام میں اس کی بیوروکریسی کا ہاتھ رہا؟

امریکی مارکسی مفکر برٹیل اولمان کا تجزیہ ہے کہ ''سوویت بیوروکریسی'' کی حیثیت محنت کش عوام کی Regency کی تھی، جب یہ محنت کش عوام پیداواری قوتوں کو نشو ونما دے کر خود بھی بلوغت کو پہنچ رہے تھے تو سوویت بیوروکریسی نے اقتدار کی امانت واپس انکے حوالے کرنے کی بجائے نظام ہی توڑ دیا۔ پاکستان میں بھی عوام دوست سماج کی تعمیر کے لئے اسٹالنسٹ سوشلزم کے مرحلے سے گزرنا ہوگا مگر اس سے بھی پہلے ترقی پسند سیاسی قوتوں کی تنظیم تو ضروری ہے۔

دنیا پر این جی اوز نے یلغار کر رکھی ہے پاکستان بھی لپیٹ میں ہے وہ جنہیں ترقی پسند ہونے کا دعویٰ تھا اکثر ان اداروں کی بھول بھلیاں میں گم ہو گئے؟

پس منظر کے طور پر ایک تو یہ بات ہے کہ پاکستان کے زیادہ تر چھوٹے بڑے دانشور، جو مارکسی یا مارکسیت نواز سمجھے جاتے ہیں وہ اپنے مطالعے اور تجزیئے کے طریق کار کے لحاظ سے مارکسی تھے ہی نہیں بلکہ 'روشن خیالی' کی 'عقلیت پسندی' سے زیادہ متاثر تھے اس لئے ان کے رویوں میں سماجی عمل اور طبقاتی جدوجہد کی حیثیت ثانوی تھی۔ دوسرے یہ کہ بیسویں صدی عیسوی کے آٹھویں عشرے میں عالمی سرمایہ داری ایک نئے دور میں داخل ہوئی جس میں مائیکرو الیکٹرانک ٹیکنالوجی کنٹینرائزیشن (Containerization) اور الیکٹرانک ابلاغ عامہ نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے، جس کے نتیجے میں جسمانی محنت کا اخراج بڑھ گیا اور ذہنی محنت کے کردار میں اضافہ ہوا اس کے علاوہ سماجی خدمات اور بہت سے تہذیبی مظاہر بھی جنس بازار بن گئے۔

اس ماحول میں ذہنی محنت کرنے والوں کی مراعات اور ملازمتوں کے مواقع زیادہ ہو گئے پھر سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں اشتراکیت کی ٹوٹ پھوٹ نے بھی درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے بظاہر مارکسی لیکن درحقیقت روشن خیال عوام دوست دانشوروں میں مایوسی پھیلا دی، اس صورتحال میں انہوں نے نظریاتی تعلیم وتربیت کے اصل ماخذوں کا نئے سرے سے مطالعہ کرنے کی بجائے یا تو مختلف طرح کے نشوں، جسمانی لذتوں، یا خانقاہوں میں پناہ لے لی یا

پھر سامراجی فنڈز سے چلنے والی این جی اوز میں اعلی مراعات کے جو دروازے کھلے انکی طرف دوڑ پڑے۔

محض ملازمتوں کی مجبوری کے تحت نہیں بلکہ نظریاتی تبدیلی کے ساتھ وہ اپنی سماجی تاریخ میں عوام کے لئے قربانیاں دینے والوں کی بھی تحقیر وتردید کرنے لگ گئے۔ اس صورتحال میں سچے عوام دوست، ترقی پسندوں پر بڑا کڑا وقت ہے سو ضروری ہو گیا ہے کہ حقیقی ترقی پسند دانشور، سماجی اور تہذیبی شعبوں میں بھی ریاست اور سامراجی این جی اوز اور سماجی وتہذیبی دائروں کے متوازی تیسری قسم کے سماجی تہذیبی ادارے بنائیں اور اپنی عوام دوست جمہوری روایات اور مظاہر کو محفوظ رکھتے ہوئے نئی نسلوں تک پہنچائیں، اس بدلی ہوئی صورتحال میں نئے وسائل کے ساتھ اپنی اور اپنے عوام کی نظریاتی اور تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارنے کا کام کریں، یہ کام ریاضت اور ایثار کا ہے، مگر ہمیں کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں سے تو ایک بار پھر اپنے کام کا آغاز کرنا ہی ہے۔

ادب کی زوال پذیری میں کیا مابعد جدیدیت کا بھی کوئی ہاتھ ہے؟

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں عالمی سرمایہ داری ایک نئے دور میں داخل ہوئی، جسمیں مابعد جدیدیت کی صورت حال بھی پیدا ہوئی اور عالمی سرمایہ دارانہ مارکیٹ کا جزو ہونے کی حیثیت سے یہ صورتحال کسی نہ کسی درجہ پر ہمارے سماج میں بھی نمودار ہوئی، اس میں محنت کشوں کی تحریکوں میں ٹوٹ پھوٹ ہوئی اور ذہنی محنت کرنے والوں کے کردار میں اضافہ ہوا اس کے ساتھ ہی مابعد جدیدیت پسندی کے نظریئے کی بھی تشکیل ہوئی جسکی گونج ہمارے علمی اور ادبی حلقوں میں سنی گئی اسی مابعد جدیدیت پسند نظریئے کے زیر اثر ہی مارکسی نظریئے کو زیادہ زور شور سے اتھاری ٹیٹو قرار دیا گیا۔

مابعد جدیدیت پسندی کا رویہ تو یہاں تک غیر علمی ہے کہ کسی بھی نظریئے، حتی کہ نیچرل سائنس کے کسی نظریئے کو بھی اتھاری ٹیٹو قرار دے دیتا ہے، مابعد جدیدیت پسندی اصل میں علمیاتی طور پر اضافیت سے کہیں آگے بڑھ کر اضافیت پرستی میں تبدیل ہوجاتی ہے، جو ہر عالم گیر صداقت یا خاص طور پر انسانی نجات کے عالمگیر نظریئے کو مسترد کرتی ہے اور چھوٹے چھوٹے تہذیبی یونٹوں کو اپنی اپنی اضافی صداقت کا معیار بنانے اور ان ہی سے کام چلانے کی ترغیب دیتی ہے۔

گویا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سرمایہ داری جتنی وسعت اور گہرائی کے ساتھ عالمگیر ہوتی جارہی ہے اور اسے انسانیت کے حق میں رد کر کے متبادل انسانیت نواز سماج قائم کرنے کے امکانات جتنے بڑھتے جارہے ہیں ان امکانات کو حقیقت میں ڈھلنے سے روکنے کے لئے مابعد جدیدیت پسندی کی حاشیہ پسندی، سماجی ریزہ کاری (Fragmentation) اور انفعالیت پسندی کو اتنا ہی پھیلایا جارہا ہے اور اس کو گوپی چند نارنگ جیسے نقاد ''تخیل کا جشن زریں'' کا خوبصورت نام دیکر ادیبوں میں قابل قبول بنانا چاہتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ انسان کو کچھ اضافی آزادیاں حاصل ہیں، جسمانی بھی اور ذہنی بھی، انسان اہم کارنامے بلکہ کوئی بھی کام اپنی بعض اضافی آزادیوں کی تحدید (حد بندی) کر کے ہی کرسکتا ہے، مثال کے طور پر ہم ایک مقام سے کسی بھی سمت روانہ ہوسکتے ہیں مگر اپنے دفتر یا گھر پہنچنے کو کوئی ایک خاص راستہ ہی اختیار کرتے ہیں باقی چھوڑ دیتے ہیں اسی طرح ادب میں تخیل اور خاص طور پر جذبہ آمیز تخیل بنیادی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اگر اس جذبہ آمیز تخیل کو کاریگری یا فنی تیکنیکوں سے کام لیتے ہوئے قابو میں نہ رکھا جائے تو ہم کوئی ادبی ہیئت تخلیق نہیں کرسکتے۔ ادبی ہیئت کی تخلیق کے لئے ہمیں تخیل کا جشن زریں منانے سے خود کو روکنا پڑے گا۔

اردو میں مارکسی جہاں بینی اور علمیات پر مواد نہ ہونے کے برابر ہے، مارکسی جہاں بینی سارے سماج کو Totality یا کلیت میں دیکھتی ہے، یہ کلیت نہ تو بند وحدت الوجودی کلیت ہے اور نہ ہی ہیگل کی بند کلیت ہے بلکہ مارکسی سماجی کلیت اپنے ماضی اور مستقبل دونوں سروں پر کھلا پن رکھنے والی کلیت ہے اور اس کلیت کے ارکان مسلسل حرکت اور نشوونما میں رہتے ہیں محض کلیت کی اصطلاح کی وجہ سے اسے Totalianism (بند کلیت پسندی) سمجھ لینا بدترین مغالطہ ہے۔ مارکسی کلیت فرد کی نفی نہیں کرتی بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ آفاقیت کو جذب کر کے ثروت مند اور یکتا ہستی میں تبدیل کرنے کا نصب العین رکھتی ہے۔ یہ بات بھی یاد آ گئی کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اجتماعی سماجی عمل میں شرکت سے فرد کی ذات کی نفی ہوجاتی ہے۔

اس مغالطے کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ فرد کی سوشلائزیشن میں جتنا اضافہ ہوتا ہے اس کی آفاقیت اور یکتائی میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ خود

سرمایہ داری نے اپنے تمام تر استحصال اور تشدد کے باوجود بنیادی سماجی تبدیلیوں کے جو امکانات پیدا کئے ہیں، انکی تعلیم، تعبیر اور عملی تعمیر و تشکیل صرف مارکسی نظرئے اور طریقہء ہی سے ہوسکتی ہے۔ادبی اور غیر ادبی ترقی پسندوں نے نہایت مشکل حالات میں جو عملی فکری تخلیقی کام کئے، وہ پاکستان کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے بھی ایک شاندار ’تحرک بخش ورثے‘ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ترقی پسندوں کے علمی اور ادبی کام پر خود ترقی پسندوں نے بھی تنقید کی ہے، جن میں، میں بھی شامل ہوں ہماری یہ تنقید، ترقی پسندوں کو مزید پر مایہ اور توانا بنانے کی خاطر ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین بحال کی گئی ہے، کیا خیال ہے؟

افسوس ناک صورتحال یہ ہے کہ سات برس ہوتے ہیں، انجمن ترقی پسند مصنفین کی ملکی سطح پر بحالی کو، لیکن یہ اب تک ادیبوں کو تنقیدی اور تخلیقی شعبوں میں نئی فکری، فنی، اور جمالیاتی توانائیاں بخشنے سے قاصر ہے اس کی بہت سی وجوہات ہونگی، ایک دو وجوہات شائد یہ ہیں کہ ہمارے اکثر موجودہ ترقی پسند اپنے محنت کش عوام سے اتنی گہری محبت نہیں رکھتے جو انہیں علمی لحاظ سے نئی نظریہ سازی کے علمی ماخذوں تک لے جانے اور اجتماعی جدوجہد میں شرکت سے انکی تخلیقی صلاحیتوں کو تابندہ تر کر سکے۔ ہمارے مقابلے میں لاطینی امریکا کے چھوٹے چھوٹے ممالک کے ادبی اور سماجی دانشور علمی اور فکری لحاظ سے کہیں زیادہ ریاضت والے لوگ ہیں۔انہوں نے مختلف علمی شعبوں میں قابل قدر اضافے کئے ہیں، مثال کے طور پر کیوبا کے ایک ماہر نفسیات نے سوویت نفسیاتی تخلیقات کی کوتاہیوں پر گرفت کرتے ہوئے اس کی زیادہ بہتر نظریہ سازی کی ہے، ہمیں بھی اپنے قومی اور عالمی دونوں طرح کے ماحول اور تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر نئے علمی وسائل سے کام لیتے ہوئے زیادہ بہتر ادبی اور فنی نظریہ سازی کی ضرورت ہے، اس کے ساتھ ساتھ اپنے عوام کی طبقاتی جدوجہد میں اپنی توفیق کے مطابق رفاقت ہی ہمارے ادب کو فکری، فنی اور جمالیاتی صورت دے سکتی ہے نئے جہانوں سے آشنا کرسکتی ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی مختلف شاخوں کو ریاستی اداروں کی نوازشات اور سامراجی تہذیبی اداروں کی مراعات سے بھی بچا کر خودمختار، عوام دوست، تہذیبی و تخلیقی ادارے بنانے کی ضرورت ہے۔عوامی ورکرز پارٹی کے مرکزی سیاسی رہنما اور ادبی نقاد، عابد حسن منٹو نے پارٹی کی ایک میٹنگ میں بڑی دلچسپ بات کہی تھی کہ پہلے جب کوئی سماجی مسئلہ پیدا ہوتا تھا تو ہم جلسہ عام کرتے تھے مگر آج کل لوگ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں سیمینار کرتے ہیں۔عابد حسن منٹو کی اس بات سے مجھے فیض احمد فیض کی ایک بات یاد آتی ہے، انہوں نے کہا تھا کہ جب لاہور کی 42 مسجدوں سے ترقی پسندوں پر کفر کے فتوے لگائے گئے تو ہم نے مرزا ابراہیم کی صدارت میں موچی گیٹ میں مزدوروں کا جلسہ عام کیا جسمیں 25 ہزار نے شرکت کی۔

یہ باتیں اس لئے اہم ہیں کہ ہمارے ہاں ادب سے لیکر اعلی سے اعلی علمی اور تہذیبی مظاہر کو عوام سے دور سے دور تر لے جانے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور اس رجحان کو بڑھانے میں بیرونی اور مقامی دونوں سرمائے کارفرما ہیں۔ میں نے پہلے بھی یہ بات کی کہ پچھلی صدی کی آٹھویں دہائی میں تہذیبی مظاہر کو جنس بازار بنانے کا رواج عام ہوا، عالمی سطح پر بھی اور مقامی سطح پر بھی۔ یاد آیا کہ 47 سے پہلے کرشن چند اور دوسرے ادباء مزدوروں کے جلسوں میں جا کر اپنے افسانے اور کلام سنایا کرتے تھے، ایسی روایات پاکستان میں بھی قائم رہیں لیکن بالائی درمیانی طبقے کے پاس دولت آئی اور ساتھ ہی سامراجی فنڈ پانے والی این جی اوز نے نیا کلچر بنایا اور ایک نئی غیر سرکاری بیوروکریسی بھی پیدا کی اس نے بھی عوام اور تہذیبی اور تخلیقی شخصیات اور کارنامے کے مابین فاصلوں کو بڑھادیا ہے۔

یہ جو کسی نہ کسی نام سے ادبی میلے بڑے ہوٹلوں میں منعقد ہو رہے ہیں ان میں بھی عام آدمی دکھائی نہیں دیتا، بالائی طبقات اور بالائی درمیانی طبقے کی مخلوقات ہی ان میں نظر آتی ہے، ایسے ادبی میلے شغل میلہ تو ہیں کوئی بڑا تخلیقی تحرک پیدا نہیں کرتے، انمیں فنی و جمالیاتی لحاظ سے شخصیت کی بلند تر تشکیل کے لئے نہ کوئی گہرائی ہوتی ہے نہ گیرائی۔ان میلوں کو دیکھ کر پھر وہی سوال سامنے آتا ہے کہ ہم اپنی ذات کو، اپنے فن کو اور اپنی اعلی سماجی اور جمالیاتی اقدار کو شو کلچر کا حصہ بنانے سے بچانے کی خاطر تیسری قسم کے عوام دوست ادبی و تہذیبی ادارے بنائیں۔ترقی پسند کی حیثیت سے اپنے عوام کی بلند سے بلند تر سطح پر جمالیاتی تعلیم بھی ہمارے فرائض میں شامل ہے اور اس کے لئے ہمارا اپنے عوام خصوصاً محنت کشوں سے رابطہ مضبوط تر ہونا چاہئے۔

☆......☆

پارلیمنٹ ،فوج اور عدلیہ کا کردار

(جناب عابد حسن منٹو کے حالیہ انٹرویو سے اقتباسات)

انٹرویو: عارف میاں

س: عدلیہ کی بنیادی ذمہ داری کیا ہے؟

جواب: عدل نام ہی عدلیہ ہے۔اس کا کام عدل کرنا ہے۔

س: کیا عدل تو بادشاہ بھی نہیں کرتے تھے؟

جواب بادشاہ کا عدل کرنے کا اپنا طریقہ کار تھا۔ بادشاہت یا آٹو کریٹ حکومتوں میں قانون وہی ہوتا ہے جو بادشاہ بولتا ہے، فیصلہ بھی وہی کرتا ہے یا اس کا کوئی مقرر کردہ آدمی کرتا ہے۔تاریخ کے تناظر میں بات کریں تو دنیا میں بہت سارے انقلابات ہوئے۔فرانس کا انقلاب ہوا، جس نے وہاں کے فیوڈل سسٹم اور بادشاہت کا خاتمہ کیا اور سوسائٹی ایک طرح کی جمہوری بنائی۔مگر کچھ ہی عرصہ بعد نپولین کی بادشاہت قائم ہوگئی۔ یہ کبھی آگے، کبھی پیچھے بڑھنے کا سلسلہ چلتا رہا۔اس سے ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ بادشاہ نہ رہا۔ جب بادشاہ نہ رہا، بادشاہ کا فرمان قانون نہ رہا تو اب قانون بنانے والا کوئی ہونا چاہیے تھا۔ اس کے لیے پارلیمنٹ بنی۔شروع میں پارلیمنٹ منتخب نہیں ہوتی تھی، اشرافیہ ہوتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ پارلیمنٹ منتخب ہونے لگی۔

انگریزوں کا جو ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا، جو پہلے صرف بادشاہوں اور منارکی کے سہارے زندہ تھا، اس میں بھی تبدیلیاں آئیں۔اس کے ادارے بدلے اور کچھ نئے ادارے بنے۔عدلیہ بھی انہی میں سے ہے۔اس کے لیے کچھ اصول شروع میں طئے ہوئے، کچھ آہستہ آہستہ ترقی کر کے بنے۔ ہندوستان میں، جس کو ہم انگریزوں کا انقلاب کہتے ہیں، جس میں صنعت آنا شروع ہوئی اور کاروباری سرگرمی کا آغاز ہوا، اسی میں یہ ہمارا عدالتی سسٹم آیا، جو اینگلوسیکسن کہلاتا ہے۔ان سارے ملکوں کے اندر جہاں انگریزوں کی حکمرانی تھی، وہاں پر اینگلوسیکسن سسٹم رائج ہوا۔البتہ مقامی حالات کے مطابق کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔جیسے ہندوستان میں دو بڑے مذاہب تھے، ہندو اور مسلمان، ان کے لیے شادی بیاہ، طلاق، وراثت وغیرہ کے لیے ان کے مذہب کے مطابق قوانین بنائے گئے۔ہندوؤں کے لیے الگ اور مسلمانوں کے لیے الگ۔ باقی جو عدالتی نظام تھا، جس میں فوجداری مقدمے، دیوانی مقدمے، پراپرٹی کے مقدمے، کنٹریکٹ کے اور پارٹنر شپ کے مقدمے یا کمپنیاں بنانے کے مقدمے ہیں، یہ سارے وہی رہے جو اینگلوسیکسن سسٹم میں تھے۔اینگلوسیکسن قوانین پر عمل کے طریقہ کار کے بھی قوانین ہیں۔ان میں سب سے بنیادی ثبوت کا قانون "law of evidence" ہے۔ شہادت یا گواہی کا قانون ہے کہ شہادت کس طرح ہوگی؟ کوئی قسم کھا کے شہادت دے گا یا کیا کرے گا؟ یہ ثبوت یا گواہی کا قانون بھی وہی ہے جو انگریزوں کا تھا۔

سوسائٹی جن عالمی حالات کے اندر ہوتی ہے، ان حالات کے مطابق جو لوگوں کے تجربات ہوتے ہیں، وہ قانون سازی کے اندر، یا قانون کی عملداری اور عدالتی اختیارات کے معاملے میں شامل کیے جاتے ہیں۔اس طرح قانون ہمہ وقت تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ضیاء الحق جو بہت بڑھ چڑھ کر اسلامی تھا، اس نے مارشل لاء کے زمانے میں اسلامی معاملات کے بارے میں خصوصی قوانین بنا لیے اور ایک علیحدہ عدالت بھی قائم کر لی جس کا نام فیڈرل شریعت کورٹ رکھا۔اتنی دفعہ الیکشن ہوئے، اسمبلیاں بنیں، آئین میں بھی تبدیلیاں کی گئیں، لیکن فیڈرل شریعت کورٹ موجود ہے۔جوڈیشل سسٹم کی حرارکی تو یہ ہے کہ مجسٹریٹ ہے، سول جج ہے، سیشن جج ہے، سیشن جج کے اوپر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ ہے۔ فیڈرل شریعت کورٹ ایک نئی عدالت قائم ہوگئی ہے۔

س: سائنس کا دَور ہے۔ہر چیز سائنٹیفک انداز میں دیکھی جاتی ہے۔کیا ججز کے صوابدیدی اختیارات ختم نہیں ہوسکتے؟

جواب: یہ کافی کم ہوئے ہیں۔کم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ختم نہیں ہوسکتے، کیونکہ بہت سارے معاملات رہیں گے جہاں صوابدید لازم ہوگی، کیونکہ ہر چیز کا جواب قانون نہیں دے سکتا۔مثلاً یہی بات کہ ایک ہی مقدمے میں دو ملزم ہیں۔ ایک اپنے برتاؤ میں فضول ہے۔دوسرے ملزم کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پہلی دفعہ جرم کیا ہے۔ویسے معقول آدمی ہے۔ظاہر ہے کہ قانون جو کہے گا سو کہے گا۔جج کا ایک اپنا رویہ بھی ہے۔صوابدید تو آجاتی ہے۔

س: سوموٹو ایکشن کی کیا فلاسفی ہے؟

جواب: سوموٹو دنیا میں ہر جگہ تو موجود نہیں ہے۔جن آئینی نظاموں کے اندر موجود ہے، ہم ان کے بارے میں ذکر کر سکتے ہیں۔مثلاً پاکستان، ہندوستان، بنگلا دیش، سری لنکا، نیپال وغیرہ کے نظاموں میں یہ ہے۔ان ملکوں کی مجموعی

آبادی 2 ارب کے قریب ہے۔ ہم اگر اس نظام جو خاص طور پر ہمارے ملک میں رائج ہے، پر بات کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ پاکستان میں سوموٹو ایکشن قانون کا پابند ہے۔ سوموٹو کا بڑا ذریعہ ہمارے آئین کا آرٹیکل 184 اور اس کی دفعہ 3 ہے۔ اس میں وضاحت ہے کہ کن حالات میں کس قسم کا سوموٹو ایکشن کر سکتے ہیں۔ بنیاد اس کی یہ ہے کہ اگر کہیں پر بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہو اور معاملہ ایسا ہو کہ عوامی اہمیت ہو، یہ نہیں کہ ایک آدمی کے بنیادی حقوق ختم ہوئے ہیں، بلکہ اس کا اثر سوسائٹی پر ہو تو بغیر کسی آدمی کے درخواست دیے سپریم کورٹ سوموٹو ایکشن کر سکتی ہے۔

ہمارے ملک میں ایک قانون وہ ہے، جو قانون ساز اسمبلی بناتی ہے۔ ایک قانون وہ ہے، جو سپیریئر کورٹ کے فیصلوں سے طئے ہوتا ہے۔ کسی بھی قانون کی توجیہہ اور تشریح کرنے کا اختیار عدالت کو ہے۔ قانون کو بدلنے اور آگے بڑھانے میں قانون کی وضاحت اور تشریح بھی بڑا کردار ادا کرتی ہے۔ اگر قانون اپنے الفاظ کے اعتبار سے مکمل ہو اور اس کا ایک ہی معنی نکلتا ہو تو نچلی عدالت کے فیصلہ میں اور سب سے اوپر کی عدالت کے فیصلہ میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے، لیکن نچلی عدالت جب قانون پر عمل کرتی ہے، لوگ غیر مطمئن رہتے ہیں اور اپیلیں کرتے ہیں۔ اپیلیں سپریم کورٹ تک جاتی ہیں۔ سپریم کورٹ میں حتمی فیصلے ہوتے ہیں۔

س: چیف جسٹس کے علاوہ بھی، سپریم کورٹ کا کوئی جج سوموٹو ایکشن کر سکتا ہے؟

جواب: اس وقت کے رولز آف پروسیجر کے مطابق چیف جسٹس ہی سوموٹو ایکشن کر سکتا ہے۔

س: پارلیمنٹ عوام کا منتخب، نمائندہ اور عوام کو جوابدہ ادارہ ہے، اس لیے اس کی آزادی اور خودمختاری کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ کہا جاتا ہے عدلیہ بھی خودمختار ادارہ ہے۔ کیا عدلیہ خودمختار ہے؟

جواب: عدلیہ کے خودمختار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ آئین کی پابند ہے، قانون کی پابند ہے، لیکن ایگزیکٹو سے آزاد ہے۔ آئین کے اندر حکومت چلانے کا جو سسٹم دیا ہوا ہے، اس کے مطابق تین ادارے آزاد ہیں۔ ان میں ایک قانون ساز ادارہ ہے، جس کا کام قانون بنانا ہے۔ دوسرا ادارہ عدلیہ ہے۔ عدلیہ کا کام انصاف کرنا ہے اور اگر قانون میں کوئی پیچیدگی سامنے آجائے، اس کا حل کرنا ہے۔ تیسرا آزاد ادارہ انتظامیہ ہے۔ انتظامیہ کا کام قانون کے مطابق اور عدلیہ کے فیصلہ کے مطابق قانون پر عملدرآمد کرانا ہے۔

س: پارلیمنٹ، عدلیہ اور انتظامیہ میں بالادستی کس ادارے کو حاصل ہے؟

جواب: یہ کافی پیچیدہ سوال ہے۔ روز اس پر بحث ہوتی ہے۔ میری رائے میں یہ واقعات اور مقدمہ پر منحصر ہے۔ اگر حکومت یا پارلیمنٹ نے کوئی ایسا فیصلہ کر دیا ہے جو آئین کے صریحاً خلاف ہے اور وہ سپریم کورٹ نے باطل "set aside" کر دیا ہے تو وقتی طور پر سپریم کورٹ کی بالادستی ہو جائے گی، لیکن پھر ایسا بھی ہے، یہ ہمارے ملک اور باقی دنیا کے بہت سے ملکوں کے اندر بھی موجود ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلے کو، عوام کے نمائندے کالعدم کر سکتے ہیں۔

س: سپریم کورٹ کے ججز نے کئی دفعہ اس قسم کے ریمارکس دیے ہیں کہ پارلیمنٹ فلاں قانون نہیں بنا سکتی۔ فلاں قانون میں ترمیم نہیں کر سکتی۔ خاص طور پر مذہب کے حوالے سے یہ ہوتا ہے۔ یہ کس بنا پر ہوتا ہے؟

جواب: عدالتیں فیصلوں کے دوران صوابدید استعمال کرتی ہیں، عوامی جذبات کو بھی دیکھتی ہیں اور اپنے تجربات کو بھی مدِنظر رکھتی ہیں۔ یہ کہ کسی اسلامی قانون میں ترمیم کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ چونکہ کہا گیا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور آئین کے اندر لکھا ہوا ہے کہ قوانین قرآن وسنت کے مطابق بنیں گے۔ آئین تو سب کو پابند کرتا ہے، قانون ساز ادارے کو بھی پابند کرتا ہے۔ یا تو آئین ساز ادارہ آئین کو بدل دے۔ اگر وہ آئین موجود ہے تو عدالتیں اس قسم کے ریمارکس دیتی ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ وہ تمام قوانین، جو پارلیمنٹ یا اسمبلی نے بنائے ہیں، چاہے وہ مذہب کے بارے میں ہوں یا شہری حقوق دیوانی کے بارے میں ہوں، پارلیمنٹ یا اسمبلی ان میں ترمیم وتنسیخ کر سکتی ہے، وہ کسی اسلامی شق کو بھی ختم کر سکتی ہے، اگر وہ متفقہ طور پر کہے کہ یہ اسلامی شق ہم منسوخ کرنا چاہتے ہیں، عدلیہ نہیں روک سکتی۔ اب صورتحال یہ ہے کہ سوسائٹی کے اندر سے دباؤ ہے کہ اسلامی شقوں کو مت بدلیں۔ مثلاً ابھی بحث آرٹیکل 62/63 کے بارے میں ہو رہی ہے۔ مذہبی جماعتوں نے کہا ہے کہ ہم تبدیلی نہیں ہونے دیں گے۔ ہم صادق اور امین کے مفاہیم کو تبدیل نہیں کرنے دیں گے۔ یہ بھی بتا دوں کہ آرٹیکل 62/63 اس طرح نہیں تھے جس طرح آج ہم پڑھ یا دیکھ رہے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ سادہ قوانین تھے کہ کونسا امیدوار الیکشن لڑ سکتا ہے۔ اس کی اہلیت، مثلاً عمر کتنی ہوگی، شہری ہوگا۔ جو عام طریقے ہوتے ہیں۔ ضیاء الحق کے زمانے میں صادق اور امین جیسی چیزیں اس کے اندر ڈالی گئیں۔ واضح طور پر ضیاء الحق مارشل لاء ڈکٹیٹر تھا۔ مارشل لاء ڈکٹیٹر

جس نے خود آئین کو برخاست کر کے، منتخب حکومت کو کالعدم کر کے، منتخب وزیر اعظم کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا، وہ صادق اور امین مانا جا رہا ہے۔ یہ تضاد ہے۔ سوسائٹی کے اندر ابھی تک حقیقی سیکولر اور ترقی پسندانہ رویہ نہیں بنا۔ کوئی سیاسی پارٹی نہیں جو بڑے پیمانے پر یہ سوالات اٹھائے اور کوئی طاقت ایسی نہیں بن رہی جو ان چیزوں کو ٹھیک کرے۔ اس لیے یہ جب تک ٹھیک نہیں ہوتیں، یہ ایسے ہی چلیں گی۔

س: پاکستانی عدلیہ کی کارکردگی، دوسرے ملکی اداروں جیسی ہی رہی ہے یا آپ عدلیہ کی مختلف اور بہتر سمجھتے ہیں؟

جواب: کس ادارے سے آپ مقابلہ کر رہے ہیں؟

س: پارلیمنٹ کے مقابل بتا دیں؟

جواب: پاکستان کی تاریخ کا آدھا عرصہ تو مارشل لاء رہے ہیں۔ پارلیمنٹ شکار رہی ہے، کالعدم رہی ہے۔ آئین کالعدم رہا۔ یہ ادارہ، جس کے اوپر مارشل لاء کا بار پڑا اور اس کے نتیجہ میں وہ بیکار ہوگیا یا کام نہیں کر سکا، اس کی تو ایسے ترقی نہیں ہوئی، لیکن عدلیہ تو اپنی جگہ کام کر رہی تھی۔

س: آپ سمجھتے ہیں، عدلیہ آزاد رہی ہے؟ جنرل عدلیہ پر اثر انداز نہیں ہوئے؟ مارشل لاء عدلیہ کو متاثر نہیں کرتے؟

جواب: جنرل عدلیہ کو ضرور متاثر کرتے ہیں، مارشل لاء بھی کرتے ہیں۔ عدالتوں نے مارشل لاؤں کو کنفرم بھی کیا ہے۔ یہ درست بات ہے، لیکن یہ تو آپ سیاسی سوال کر رہے ہیں۔

س: عدلیہ کا کردار ملک کے دوسرے اداروں کی نسبت بہتر رہا ہے؟

جواب: بہتر کا لفظ تو نہیں استعمال کروں گا۔ یہ کہوں گا کہ مناسب رہا ہے، لیکن عدلیہ کو ایک جمہوری ریاست میں جو کردار ادا کرنا چاہیے تھا، وہ اس نے ادا نہیں کیا۔

س: ماضی میں ججوں نے ڈکٹیٹروں کی حمایت بھی کی ہے؟

جواب: حمایت نہیں کی، کنفرم کیا ہے۔ اس میں فرق ہے۔ انھوں نے آ کے کہا کہ مارشل لاء لگ گیا ہے۔ آپ اس کے ماتحت کام کریں گے یا آپ فارغ ہیں۔ مارشل لاؤں کے زمانے میں جج فارغ نہیں ہوئے۔

س: ججوں کے اس کردار کو اختیار سے تجاوز کہیں گے یا نا اہلی؟

جواب: میں کوئی تکنیکی بات نہیں کہنا چاہ رہا۔ یہ موقع پرستی "opportunism" ہے۔ ایک جج جب یہ سمجھتا ہے کہ جو نظام نافذ ہوا ہے، یہ اس کی تربیت کے مطابق نہیں ہے اور عدالتی آزادی "judicial independence" میں مداخلت کرتا ہے تو اس کو جج سے استعفےٰ دے دینا چاہیے۔ انھوں نے نہیں دیے۔ یہ موقع پرستی ہے۔ ہماری سوسائٹی میں مڈل کلاس، اپر مڈل کلاس، موقع پرستی کا شکار رہی ہے۔ اس میں جج بھی شامل ہیں۔

س: مارشل لاء لگنے کی صورت میں ججوں کی آئینی وقانونی ذمہ داری کیا بنتی تھی؟

جواب: ذمہ داری تو یہ بنتی تھی کہ جس آئین کی انھوں نے قسم کھائی ہوئی تھی، اس کی پابندی کریں۔

س: جج دباؤ کے تحت بھی فیصلے کرتے ہیں؟

جواب: عام اصول تو نہیں کہہ سکتا، لیکن جب مارشل لاء لگ جاتے تھے تو ایک دباؤ خود بخود آ جاتا ہے۔ کسی نے آ کے نہیں انھیں کہنا تھا کہ آپ ہماری مرضی کے مطابق فیصلہ کریں۔ مگر یہ تو ان کے اپنے ضمیر کا سوال تھا کہ بھئی جس آئین کے تحت ہم نے حلف اٹھایا تھا، وہ ٹوٹ گیا۔ ایک نیا نظام قائم ہوگیا۔ جو آئین سے ماورا ہے اور جو جمہوری نہیں ہے۔ کیا ہم نے کام کرنا ہے یا نہیں؟ میں نے کہا ہے کہ یہاں اکثریت چاہے وہ عام سرکاری ملازم ہو، عدالت کا جج ہو، حتیٰ کہ سیاسی لوگ، یہ سارے موقع پرستی کا شکار رہے ہیں۔

س: کیا ہماری عدلیہ کے جج صاحبان کا ذہنی رویہ ملک کے دوسرے اداروں کے لوگوں سے مختلف نہیں رہا؟ کیا جج بھی موقع پرستی کا اسی طرح شکار رہے ہیں جس طرح دوسرے رہے ہیں؟

جواب: ہاں۔ ہمارا ایک غیر معمولی ملک ہے۔ اس میں عام قوانین، عام اصول لاگو نہیں ہوتے اور ہو نہیں سکتے۔ ایک تجربہ بتاتا ہوں۔ میں سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کا صدر تھا، جب 1997ء میں میاں نواز شریف اور ججوں کے درمیان بہت بڑا تنازعہ شروع ہوگیا۔ مجھے حکومت اور ججوں کے درمیان مذاکرات کرانے کا موقع ملا۔ جب میں نے چیف جسٹس سے کہا کہ پورے ججوں کو بلا کے میٹنگ کریں، مجھے بات کرنی ہے اور انھوں نے میٹنگ بلائی۔ وہیں مجھے پتہ چلا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ فل کورٹ میٹنگ کئی سالوں کے بعد ہوئی ہے۔ ایک ایسے ملک کے اندر کہ جہاں آئے روز بڑے واقعات ہوتے ہیں، وہاں ججوں کی فل کورٹ میٹنگز ہونا ضروری ہیں۔

س: پاکستان کی سپریم کورٹ نے ملٹری کورٹس کی بھی اجازت دی ہے؟

جواب: یہ اب دی ہے۔ میں اس فیصلے کو قبول نہیں کرتا۔ یہ متفقہ فیصلہ نہیں

ہے۔مختلف ججوں نے مختلف آرا"judgements" لکھی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں جو پرانا نظریہ ضرورت تھا، جس کو 2007ء میں کالعدم کر دیا گیا تھا اور اس کے اوپر سیاہی پھیر دی گئی تھی کہ یہ غلط نظریہ تھا، اس کیس میں اس کو استعمال کیا گیا ہے کہ یہ وقت کی ضرورت ہے۔ضرورت کیا ہے؟ مقدمے التوا میں ہیں۔ملزموں کو سزائیں نہیں مل رہیں، وغیرہ وغیرہ۔ بھئی ملزموں کو سزائیں دینے کا جو قانون ہے ساری دنیا کے اندر، ہندوستان میں اور ہمارے ملک میں بھی، اس کے مطابق جو ضابطہ فوجداری "criminal code" ہے اور ضابطہ تعزیرات "penal code" ہے، اس کو آپ درست کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور ایک نیا قانون جو کہ نافذ سسٹم سے انحراف ہے، وہ آپ بنانے کے لیے تیار ہیں۔ میں اس کے خلاف ہوں۔

س: اعلیٰ عدالتوں خصوصاً سپریم کورٹ کے جج اکثر پولیس، نیب کے افسروں، سیاستدانوں یعنی دوسرے اداروں کے عہدیداروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ بڑے سخت ریمارکس دیے جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں سپریم کورٹ نے نیب کے بارے میں ریمارکس دیے: نیب نے ادارے تباہ کر دیے۔منتخب وزیراعظم میاں نواز شریف کے لیے سپریم کورٹ کے جج نے گاڈ فادر، سسلین مافیا ایسے الفاظ استعمال کیے۔ جج کے لیے اس قسم کی چیزیں موزوں ہیں؟

جواب: کیا چیز موزوں ہے! بھئی آپ سوالات اٹھا رہے ہیں جو ہماری سوسائٹی میں مستقل ہیں، ہماری سوسائٹی کا حصہ ہیں۔ان کو بار بار دھرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔جتنی بار بھی آپ پوچھیں گے میرا جواب ہوگا، یہ سب چیزیں سوسائٹی کا حصہ ہیں۔

س: 1958ء میں آرمی سربراہ جنرل ایوب نے ملک میں مارشل لاء لگایا۔ اس پر سپریم کورٹ کا کیا ردِعمل تھا؟

جواب: ایک ردِعمل یہ تھا: میاں محمود علی قصوری بڑے وکیل تھے اور ایک جمہوریت پسند سیاسی آدمی بھی تھے۔ چیف جسٹس کیانی نے ان کو بلا کے یہ کہا، میاں صاحب! میں آپ کو ہائی کورٹ کا جج بنانے کے لیے آپ کی سفارش کرنے لگا ہوں۔انھوں نے کہا میں نے تو نہیں جج بننا۔کیانی صاحب نے جواب میں کہا، میں نے یہ نہیں کہا کہ آپ کو شوق ہوگا یا آپ بننا چاہیں گے۔آپ یقیناً بہت زیادہ کماتے ہیں، جج کی تنخواہ تھوڑی ہے، لیکن جو نئے سیاسی حالات پیدا ہو گئے ہیں، اس میں آپ کا تحفظ ہو جائے گا، آپ کو کوئی پکڑے گا نہیں۔میرا مطلب یہ ہے یہ چیزیں چلتی رہتی ہیں۔آپ کے سوال کی طرف آتا ہوں۔کیانی صاحب عدالت میں بیٹھے رہے۔ چلتے رہے۔ایک بات اور بتاتا ہوں۔ پاکستان میں جو پہلا مارشل لاء لگا۔اس پر بہت سخت ریمارکس ہائی کورٹ کے دو ججوں نے دیے تھے، اس کے باوجود دیے تھے کہ آئین معطل ہو چکا تھا۔ججوں نے کہا کہ یہ انسانی حقوق کے خلاف ہے۔وہ میر حسن کیس ہے جس میں یہ ریمارکس دیے گئے، لیکن مجموعی طور پر، میں پھر زور دے رہا ہوں، ہمارا مڈل کلاس، اپر مڈل کلاس، جس کی ہمہ وقت کوشش رہتی ہے کہ اور زیادہ اوپر والی کلاس میں چلا جائے، یہ سب سماجی اور سیاسی طور پر موقع پرستی کا شکار ہیں۔ یہ سوسائٹی ابھی تک واضح جمہوری سیاسی موومنٹ پیدا نہیں کر سکی جو اس کی ضرورت ہے۔ وہی جمہوری سیاسی موومنٹ اس کو سارے جنجال سے نکالے گی جو عوام کی ہوگی، نچلے طبقوں کی ہوگی۔ان لوگوں کی ہوگی جو حقیقی طور پر جمہوریت پسند ہیں اور یہ موومنٹ ہر اس آدمی کا کام ہے جو یہ سوالات پوچھتا ہے، جو آپ پوچھ رہے ہیں۔سوالات پوچھنے چاہئیں اور ان سوالات کو سیاست کے اندر لانا چاہیے۔کرپشن بنانے والا سسٹم ختم کرنا چاہیے۔

س: آپ نے پہلے ذکر کیا کہ ججز نے مارشل لاؤں کی حمایت نہیں کی مارشل لاؤں کو کنفرم کیا۔ایوب خان کے مارشل لاء کو جب سپریم کورٹ نے کنفرم کیا تو کچھ جواز تراشا ہوگا۔وہ کیا جواز تھا؟

جواب: یہ نظریہ ضرورت کا سارا تصور اسی وقت پیدا ہوا۔اسی وقت جسٹس منیر کے زیرِ اہتمام عدالت نے پیدا کیا۔ بھئی حالات خراب ہیں، سات آٹھ وزرائے اعظم بدل چکے ہیں۔کوئی شکل نہیں بن رہی۔

س: اس طرح کی توجیہہ،تشریح عدلیہ دے سکتی ہے؟

جواب: عدلیہ نے دی تھی اور پاکستان میں سالہا سال تک چلتی رہی۔ یہ جو نظریہ ضرورت سپریم کورٹ نے ایجاد کیا جسٹس منیر کے زیرِ اہتمام، ایک سے زیادہ مارشل لاء لگے، ہر دفعہ یہی نظریہ ضرورت استعمال ہوا۔عدالتوں نے اسے کنفرم کیا۔پھر عدالتوں نے ہی نہیں جب اسمبلی منتخب ہو کے آ گئی اس نے بھی ان چیزوں کو کالعدم نہیں کیا۔

س: آپ نے بتایا سپریم کورٹ آئین کے آرٹیکل 184/3 کے تحت بنیادی انسانی حقوق کے لیے محدود طور پر سوموٹو ایکشن کر سکتی ہے۔ پاکستان میں سپریم کورٹ نے سوموٹو ایکشن مجموعی طور پر کیسا کیا ہے؟

جواب: بہت ساری تنقید ہوئی ہے اس پر، اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ

اس نے کئی راستے کھولے ہیں۔ عدالت کے اوپر آجاتا ہے کہ وہ 184/3 کا اطلاق کس طرح کرتی ہے۔ اگر وہ صرف اپنے اختیارات کو بڑھانے کے لیے ہی استعمال کرتی ہے تو بے معنی ہے۔

س: استعمال اچھا ہوا ہے یا بُرا؟

جواب: کبھی ٹھیک ہوا ہے۔ کبھی فضول ہوا ہے۔

س: کیا سپریم کورٹ 184/3 کے تحت عوام کے اندر یہ اعتماد پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی ہے کہ عوام کے بنیادی حقوق کو کوئی خطرہ نہیں ہے؟

جواب: سوال یہ ہوتا ہے کہ عوام کے بنیادی حقوق کون پامال کر رہا ہے؟ کس کے خلاف عدالت میں جائیں؟ یہ معاملہ اداروں سے بھی تعلق رکھتا ہے اور مجموعی طور پر سوسائٹی کے اندر، کس جگہ سے یہ پامالی ہوئی ہے، اس سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی کچھ لوگوں کا اعتماد اس بات پر ہے کہ اگر اور کوئی نہیں سنتا تو عدالت میں، ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ جا کے اپنا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔

س: سپریم کورٹ نے چار مارشل لاؤں کو کنفرم کیا۔ ایک منتخب وزیر اعظم کو پھانسی لگوا دیا۔ دو منتخب وزرائے اعظم کو گھر بھیجا، ان کی حکومتیں ختم کیں۔ جمہوری سسٹم کو کمزور کیا۔ اس کے باوجود آپ یہ سمجھتے ہیں؟

جواب: جن سیاسی مقدمات میں اور جن سیاسی قوتوں کے خلاف یہ فیصلے ہوئے، ان قوتوں کے بارے میں عوام کی رائے کیا ہے؟ مثلاً نواز شریف سپریم کورٹ سے نااہل ہوئے، جس پر جھگڑا پڑ گیا قوم کی سطح پر اور قوم تقسیم ہوگئی، اس بات کے اوپر کہ یہ کام آئین اور قانون کے مطابق ہونا چاہیے تھا یا نہیں؟ یہ قانونی تھا یا سیاسی تھا؟ فیصلہ درست ہوا یا نہیں درست ہوا؟ یہ رائے بھی تو موجود ہے جو کہتی ہے کہ ٹھیک ہوا۔ مجموعی طور پر ہماری سوسائٹی آئین اور قانون کے باوجود پیچھے گئی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ پہلے بھی کوئی مقدمہ ہار جاتا تھا اور کوئی جیت جاتا تھا، لوگوں کا پہلے جیسے عام تصور رہتا تھا کہ عدالت سے انصاف مل جائے گا، وہ تصور اب اتنا مضبوط نہیں رہا۔

س: ماضی میں ججوں نے مارشل لاؤں، آمروں کو کنفرم بھی کیا ہے۔ کیا کبھی کسی جج کو سزا ملی ہے؟

جواب: کہاں جا کے آپ شکایت کریں گے۔ پہلا سوال تو یہی ہے۔ مثلاً ایوب خان نے جب مارشل لاء لگایا تو وہ دس سال تک چلتا رہا۔ جب اس کی طاقت ختم ہوگئی تب بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ایوب خان کا جو مارشل لاء تھا، اس کا اس بنیاد کے اوپر اور جن ججوں نے اس کو کنفرم کیا، ان کا اس بنیاد کے اوپر ٹرائل کیا جائے۔ کیوں نہیں کہا؟ پہلے تو ججوں نے کہا کہ نظریہ ضرورت ہے اور اس کو کنفرم کر دیا جائے۔ اس کے بعد جو پارلیمنٹ منتخب ہوئی اس نے ساری کی ساری چیزیں منظور کر لیں۔

س: وہ پارلیمنٹ آزادانہ تو منتخب نہیں تھی۔ اس کی کیا حیثیت تھی؟

جواب: میرا مطلب ہے، یہی ادارے ہیں جن کے ذریعے آپ عمل کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اسی طرح سے ہے۔

س: اگر ججز کا کام ہے کہ وہ آئین کی حفاظت کریں۔ انھوں نے مارشل لاؤں کو کنفرم کیا۔ کیا یہ بہت سنگین جرم نہیں ہے؟

جواب: صرف ججز کا نہیں، اس میں فوج شامل ہے۔ پہلے تو جنھوں نے یہ سارا کام کیا اور فوج کی جو احرار کی ہے، اس کو کبھی کسی نے پوچھا، بھئی آپ نے یہ کیسے مارشل لاء لگایا؟ یہ وہاں ممکن ہے جہاں سیاسی تحریک طاقتور ہو اور وہ یہ مطالبہ کرے۔ میرے اور آپ کے مطالبہ کرنے سے تو یہ نہیں ہوسکتا۔ مریم نواز نے این اے 120 کا الیکشن جیتنے کے بعد جو تقریر کی، اگر آپ نے غور سے سنی ہو، انھوں نے ان تمام اداروں کے اوپر تنقید کی جو ان کے کہنے کے مطابق خفیہ ہاتھ ہیں، ان دیکھی قوتیں ہیں، انھوں نے ان سب کا حوالہ دیا۔ ان کی تقریر اس بات کے اوپر تھی اور یہ بالکل حقیقت ہے۔ اس کے اوپر دوسری رائے نہیں ہے۔ ان کے مطابق لوگوں نے تو صحیح فیصلہ کر دیا۔ ان دیکھی قوتوں کے ساتھ جو لوگ کھڑے تھے ان کو شکست ہوئی، لیکن آپ دیکھیں کہ اس کے باوجود جو ان دیکھی قوتوں والی پارٹی تھی، اس نے بھی ایک بڑی تعداد میں ووٹ لیے۔

س: کیا آپ بتانا چاہ رہے ہیں کہ ان دیکھی قوتوں کی پاکستان میں 1947ء سے حکمرانی ہے، ان کی بالادستی ہے۔ انھوں نے جڑیں بنائی ہوئی ہیں۔ ان کی جڑیں قائم ہیں؟

جواب: ہاں یہی ہے۔

س: عوام کے منتخب نمائندوں کے معاملات عدلیہ کے پاس آتے ہیں، اس لیے عدلیہ انھیں جب مناسب سمجھے گھر بھیج سکتی ہے۔ وزرائے اعظم یوسف رضا گیلانی اور میاں نواز شریف کے متعلق فیصلوں کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ آپ نے ان کو کیسے دیکھا؟

جواب: میں تو خود کہہ رہا ہوں کہ بھئی سپریم کورٹ نے یہ کیا فیصلہ کیا؟ سپریم کورٹ نے سیاسی معاملے کے اوپر، میاں نواز شریف کے خلاف ایسا فیصلہ دیا جس کے اوپر پوری دنیا میں تنقید ہوئی۔ بے شمار وکیلوں نے اخبارات میں، میڈیا

میں بیانات دیے۔ اشتہار چھاپا کہ سپریم کورٹ نے یہ کیا فیصلہ کیا۔

بات سنئے، پاکستان کے چیف جسٹس ہیں۔ انھیں تو آئین پڑھا ہونا چاہیے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ آئین میں کیا لکھا ہے۔ انھیں یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ وہ ملک کے چیف جسٹس ہیں۔ وہ کوئٹہ میں تقریر کرتے ہیں۔ تقریر کے دوران وہ کہتے ہیں کہ دوقومی نظریے میں ایک مسلمان قوم تھی، دوسری وہ قوم جس کا میں نام بھی نہیں لینا چاہتا۔ بھئی جس قوم کا آپ نام نہیں لینا چاہتے، پاکستان کا پہلا وزیرقانون اس قوم سے تھا اور جناح صاحب نے اس کو مقرر کیا تھا، جس قوم کا آپ نام نہیں لینا چاہتے، پاکستان کے جھنڈے میں اس کی نمائندگی ہے جو سفید حصہ ہے۔ یہ چیف جسٹس آف پاکستان کا حال ہے۔

س: عابد منٹو صاحب! ہمارے سامنے آئین نہ ہوتا تو ہم طاقت کی بنیاد پر بات کرتے۔ آئین ہے۔ ہم نے آئین پر عمل کرنا ہے اور دوسروں کو عمل کرنے کی ترغیب دینی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم آئین کی بنیاد پر بات کریں۔ کیا یہ نہیں ہے؟

جواب: کیا ہمارے ملک کی سیاست ایسی ہے؟ کبھی ایک جماعت کبھی دوسری، فوجیوں سے مل کر حکومت نہیں کرتی؟ جس بنیاد کے اوپر آپ چاہتے ہیں سول اتھارٹی اپنے آپ کو منوائے اور آئینی حکمرانی ملک کے اندر قائم ہو، اس کا اپنا حال یہ ہے کہ وہ اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے، الیکشن جیتنے کے لیے، فوج سے مدد لینے کے لیے تیار رہتی ہے۔

س: ملک کے اندر فوج کا ایک اپنا کردار ہے۔ فوج کے اپنے اندر بے شمار قباحتیں اور کمزوریاں ہیں۔ تاریخ ہمارے سامنے ہے کہ فوج نے پاکستان کے لیے کیا کردار ادا کیا اور کتنا فائدہ یا نقصان پہنچایا ہے۔ کیا فوج کی کمزوریوں کے سبب سویلین جا کے زبردستی غیرآئینی جنرل بن کے بیٹھ جائیں؟

جواب: فوج میں اس وقت 6 یا 7 لاکھ لوگ ہیں۔ وہ دیہاتوں اور نچلے طبقوں کے لوگ ہیں۔ کیا وہ سیاسی طور پر سوچ سکتے ہیں؟

س: وہ نچلے طبقوں کے لوگ کس کے ساتھ ہیں؟ قانون کے ساتھ یا جرنیلوں کے ساتھ؟

جواب: یہی بات ہے۔ فوج بطور ادارہ ایک اور کردار پیدا "develop" کرتی ہے اور وہ کردار فوج کی اپنی ضرورت کے مطابق ہے۔

س: یہ بات عام کہی جاتی ہے کہ فوج کی بات نہ کریں۔ کسی جنرل کی بات کریں۔ کیا جو بھی سپاہی ہے، حوالدار ہے، میجر ہے، وہ سارے ایک سسٹم کے تحت چیف آف آرمی سٹاف کے ساتھ نہیں ہوتے؟ کیا کبھی کسی جنرل نے آرمی چیف کے سامنے کہا ہے کہ سر! آپ آئین کو کیوں روندنے جارہے ہیں۔ ہم سب کا کام تو آئین کے تحت ملکی سرحدوں کی حفاظت ہے۔ ہمارا سیاست یا اقتدار سے کیا تعلق؟ ہم کیوں اقتدار پر قبضہ کرنے جارہے ہیں؟ فوج کے بطور ادارہ اپنے مفادات بھی ہوسکتے ہیں۔ وہ اپنے مفادات کے لیے بھی اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ کیا سویلین کا کام یہ ہے کہ وہ بس یہ کہے کہ فلاں جنرل غلط تھا۔ فوج درست تھی؟

جواب: میں صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ جن ملکوں میں مرکزی دھارے کی سیاست "main stream politics" طاقتور ہوتی ہے، وہاں پر فوج کا کردار خود بخود صحیح رہتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ہندوستان میں فوج کا کردار مودی کی حکومت میں اور ہو اور کانگریس کی حکومت میں اور۔ پاکستان میں تو فوج کا ایک کردار ہوگیا۔

س: عوام اور پیپلز پارٹی کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی فوج نے چیئرمین بھٹو کو پھانسی لگوادی؟

جواب: وہ ایسے اتنی آسانی سے نہیں کیا۔ وہ خود جب پیپلز پارٹی کی حکومتوں کا کردار بدلنا شروع ہوا تو یہ ہوا۔

س: آپ کی بطور قانون دان، آئین وقانون سے کمٹ منٹ ہے؟

جواب: میری کمٹ منٹ کے مطابق تو یہ آئین بھی فضول ہے۔ جو ریاست مذہب اپناتی ہے، وہ فضول ہے۔ اگر میرا اختیار اور میری طاقت ہو تو میں اس آئین کو ایک سیکولر آئین میں تبدیل کروں۔

س: پہلے تو ہمیں اس اصول پر پختہ ہونا چاہیے کہ جو بھی آئین ہو، یا ہے یا آئندہ بھی ہوگا، ہم اسے اہمیت دیں۔ کیا رائے ہے؟

جواب: میں کوئی غیرآئینی بنیاد پر بیان نہیں دے سکتا۔ میں موجودہ آئین کی بنیاد پر بیان یوں دوں گا کہ جو ہمارے ملک میں ادارے ہیں اور عوام ہیں، جو بھی آئین کے مطابق قوانین موجود ہیں اور جو آئینی ڈھانچہ ہے، انھیں ان کا پابند ہونا چاہیے۔ میرے لیے یہ پابندی نہیں ہے، چونکہ میں ایک سیاسی ہستی "entity" ہوں اور میں اپنے آئین کو بھی بدلنا چاہتا ہوں جو کہ میرا حق ہے لیکن کوئی ادارہ یا آدمی یہ کام نہیں کرسکتا۔

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ عدلیہ کا اختیار ملکی آئین، قانون اور نظیروں تک محدود کرنے کی ضرورت ہے اور عدلیہ کو دنیا بھر کی عدالتوں کے فیصلوں اور

ڈکشنریوں سے سہارہ لینے، ملکی آئین کو نظر انداز اور بے وقار کرنے سے روکنا چاہیے؟

جواب: میں کوئی ایسا فارمولا نہیں ایجاد کرسکتا۔ پاکستان سمیت جب کسی ملک کے اندر قانونی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے اور تشریح کرنے کے لیے کوئی نظیر اپنے ملک کے اندر پہلے سے موجود نہیں ہوتی تو پھر راستے نکالنے پڑتے ہیں کہ ان الفاظ کا، ان جملوں "phrases" کا، اس سیکشن کا، اس آرٹیکل کا کیا مطلب ہے؟

س: اگر کمی ہو، وضاحت نہ ہو، نظیر نہ ہو اور معاملہ بہت اہم ہو تو وہ پارلیمنٹ کے اندر کیوں نہیں بھیجا جاسکتا؟

جواب: ابھی ہم عدالتوں تک محدود ہیں نا۔ پارلیمنٹ تو سب چیزوں کو برخاست کرسکتی ہے۔ جب عدالت کے سامنے یہ بات آگئی کہ آئین کے اندر لکھا ہوا ہے کہ ہر آدمی برابر ہوگا، مساوات ہوگی۔ مساوات کا مطلب کیا ہے؟ لوگ شعوری طور پر برابر نہیں ہیں۔ تعلیم کے اعتبار سے برابر نہیں ہیں۔ جسمانی صلاحیت کے اعتبار سے برابر نہیں ہیں۔ مساوات کیسے ہوگی؟ پھر اس کی کوئی تشریح کریں گے کہ مساوات کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ دوسری جگہوں پر لوگوں نے کیا مطلب نکالا ہے۔ آپ کہتے ہیں پاکستان کے اندر آئین پڑھنے والے لوگ صرف پاکستان کا آئین پڑھا کریں۔

س: آپ نہیں سمجھتے کہ پاکستان کی تاریخ نے جس طرح سفر شروع کیا، اس میں عدلیہ کا بھی ایک بہت بڑا کردار ہے؟

جواب: اگر ججوں کی ایک فل کورٹ میٹنگ ہو، جو 16، 17 جج ہیں، وہ چیف جسٹس کی صدارت میں بیٹھیں اور چیف جسٹس کہیں کہ جی پاکستان کے اندر ایک انتشار مچا ہوا ہے، مسئلہ ہے، ہمیں اپنا کوئی کردار ادا کرنا چاہیے۔ میں آپ کو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آج بھی شائد اِکا دُکا آواز اٹھے گی کہ ہمارا اس میں کوئی کردار نہیں ہے۔

س: نظریہ ضرورت کے سامنے بند کیسے باندھا جاسکتا ہے؟

جواب: وہ تو ایک موقع پرستی کا نظریہ تھا۔ نظریہ ضرورت کی بنیاد کیا ہے؟ بنیاد یہ ہے کہ آئین اور قانون ان مسائل کا کوئی حل نہیں پیش کرتا۔ لہٰذا ہم حل پیش کریں۔ یہ نظریہ ضرورت ہے۔ حل موجود ہے، اس کے اوپر عملدرآمد نہیں کر رہے۔ ایک معاملہ جس کا حل سیاسی طور پر نکلنا چاہیے تھا۔ وہ عدالت میں چلا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں اب ہمیں راستہ نکالنا پڑے گا۔ اس سے خرابی پیدا ہوجاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ معاملہ پھنس گیا ہے۔ سیاسی نظام جو موجود ہے، وہ اس کا حل نہیں دے رہا۔ آئین اور قانون کے اندر تشریح موجود نہیں ہے۔ اس کی تشریح عدالت کرسکتی ہے۔ آئین اور قانون کی تشریح عالمی طور پر عدالتوں کا کام ہے۔ یہ مانا ہوا اصول ہے۔

س: انڈیا کے اندر سیاستدانوں اور دوسرے لوگوں پر کرپشن کے الزامات لگے۔ بہت بڑی بڑی احتجاجی تحریکیں چلیں۔ احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ ہم پاکستانی سمجھتے رہے کہ انڈیا ہل گیا۔ حکومت ہل گئی۔ وہاں کی عدلیہ نے کبھی نظریہ ضرورت کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ نہ ایسا کوئی حل ایجاد کیا۔ پاکستان کی عدلیہ کو یہ اعزاز حاصل ہے۔ خاص کیا وجہ ہے؟

جواب: دونوں کی تاریخ مختلف ہے۔ آپ نے پاکستان کب بنانا شروع کیا؟ 1940ء سے پہلے کوئی پاکستان کی تحریک تھی؟ نہیں تھی۔ آپ کا ملک 1940ء تک ہندوستان تھا۔ 1940ء میں قرارداد پاس کی اور پاکستان کی ایک موومنٹ بنی۔ 6 سال کی تاریخ ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک 70، 80 بلکہ 100 سال پر محیط ہے۔ وہ 19 ویں صدی کے آواخر میں شروع ہوئی اور 20 ویں صدی کے وسط میں ختم ہوئی۔ دونوں ملکوں کے اندر جو سیاسی ادارے ہیں، ان کی پختگی، ان کی سوچ سمجھ، سسٹم کو چلانے کی صلاحیت، ان کے پس منظر میں ہے۔ پھر انڈین نے 51-1950ء میں اپنا آئین بنایا۔ وہ آئین کبھی بدلا نہیں۔ کبھی ٹوٹا نہیں۔ کبھی اس کو معطل نہیں کیا گیا سوائے اندرا گاندھی نے جو مختصر عرصہ کے لیے ایمرجنسی لگائی۔ اندرا گاندھی کی ایمرجنسی کو سپریم کورٹ نے ختم کر دیا۔ پاکستان میں آئین بار بار منسوخ ہوتا رہا۔ اس سے سیاسی ادارے، جو نارمل آئینی ادارے ہوتے ہیں، وہ بہت حد تک پیچھے چلے گئے۔ طاقتور نہیں رہے۔ ان کی حیثیت کوئی نہیں رہی۔ جو غیر جمہوری ادارے تھے ان کی حیثیت زیادہ بڑھ گئی۔ اب پاکستان کی جو مخلوق ہے، 20 کروڑ سے زائد لوگ ہیں۔ یہ جن دیہاتوں اور قصبوں اور علاقوں میں رہتے ہیں، وہ اپنے لیے ایک پُرامن سوسائٹی چاہتے ہیں۔ وہ سیاست میں اتنے زیادہ ملوث نہیں ہوتے۔ ان کے لیے حالات اور ہیں۔ ہم جو بحثیں کررہے ہیں یہ شہری "urban" بحثیں ہیں۔ یہ وہ بحثیں ہیں جو شہروں کے اندر اور اشرافیہ "elite" کے درمیان چلتی ہیں، کیونکہ ہم براہِ راست حکومتیں بنانے اور چلانے کے ساتھ منسلک رہتے ہیں۔ انڈیا میں جو ہورہا ہے اس کی اپنی وجوہات ہیں۔ پاکستان میں جو ہورہا ہے اس کی اپنی وجوہات ہیں۔ جب آپ وجوہات ختم کریں گے...... یہ ایک لمبی جدوجہد ہے۔ یہ نہ مسلم لیگ کرسکتی ہے نہ تحریک انصاف کرسکتی ہے نہ آج کل کی پیپلز پارٹی کرسکتی ہے۔

یہ کوئی نہیں کرسکتا۔ یہ وہی لوگ کریں گے جو نئے آئیں گے اور نئی سیاست کریں گے۔

س: آپ چاہتے ہیں کہ عوام کی نمائندہ جماعتوں کو ایک مفروضے کی بنیاد پر رَد کر دیا جائے؟

جواب: میں لوگوں کو تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ رَد کریں۔ میں نے رَد کیا ہے تو اپنی پارٹی بنائی ہے۔ آپ کے کہنے کے مطابق تو مجھے پیپلز پارٹی میں شامل ہونا چاہیے تھا یا مسلم لیگ میں چلے جانا چاہیے تھا۔

س: آپ نے کہا، لوگ کہتے ہیں معاملہ پھنس گیا ہے۔ اس لیے عدلیہ کو معاملہ لینا پڑتا ہے۔ لوگ کون ہیں؟ لوگوں، عوام کی نمائندگی سیاسی پارٹیاں نہیں کرتیں اور کیا سیاسی پارٹیوں کی نمائندہ حیثیت کا امتحان الیکشن میں نہیں ہوتا؟

جواب: ججز حوالہ دیتے ہیں۔ ہمارے ملک کے جو 70 سال ہیں، ملک جمہوری طریقوں سے چلا نہیں ہے۔ جب چلا نہیں جمہوری ادارے طاقتور نہیں ہیں۔ سیاسی جماعتیں طاقتور نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں طاقتور جماعت کا یہی مطلب ہے کہ ایک جماعت نے بہت سارے منتخب قابل "electable" اکٹھے کر لیے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے نقطہ نظر، اپنی فکر یا منشور کے مطابق کوئی پارٹی ہو۔ اب ایسا تو نہیں ہے۔ کسی زمانے میں بھٹو نے سیاسی پارٹی بنائی تھی، باوجود یکہ وہ پہلے 9 سال اسٹیبلشمنٹ کی خدمت گزاری کرتے رہے۔ ایوب خان کے ساتھ جڑے رہے، لیکن جب انھوں نے جمہوری راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی تو لوگوں کی بڑی اکثریت نے ان کا ساتھ دیا۔

س: پھر بھٹو کا کیا بنا؟

جواب: اگر آپ اس بنیاد پر جائیں گے کہ فوجوں کی طاقت کتنی ہوتی ہے اور سول اتھارٹی کی کتنی؟ تو جن ملکوں کی بہت بڑی بڑی فوجیں ہیں، وہاں ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہاں سول انتظامیہ کی طاقت کا پلڑا ملٹری کی طاقت سے بھاری رہتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ دنیا میں اس وقت سب سے طاقتور انڈسٹری اسلحہ کی انڈسٹری ہے۔ پینٹا گون اسلحہ کی انڈسٹری کو سپورٹ کرتا ہے۔ دنیا میں جو لوگ اسلحہ کا کاروبار کرتے ہیں، تجارت کرتے ہیں ان کا مفاد یہ ہے کہ یہ چیزیں چلتی رہیں۔ تنازعے بھی اسی وجہ سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر تنازعے نہیں ہوں گے، امن و امان ہوگا تو یہ انڈسٹری بیٹھ جائے گی۔ یہ ہمیشہ سے ہے۔ سرمایہ داروں کا بین الاقوامی طور پر جو نظام بن چکا ہے، وہ کنفیوژڈ ہے۔ اس میں فوج، اسلحہ یہ سب چیزیں داخل ہیں۔

س: سسٹم کنفیوژڈ ہونے کا مطلب ہے اداروں کے اختیارات آئین میں واضح نہیں ہیں۔ اگر اداروں کے اختیارات کی آئین میں وضاحت موجود ہے۔ اس کو کوئی ایک ادارہ نظرانداز کرتا ہے، اس میں کنفیوژن کیا ہے؟

جواب: یہ تو نہیں کہ ہمارے ملک کا آئین انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ اس کی انگریزی کے معنی کیا ہیں؟ آئین کی تشریح کرتے کرتے آپ نظریہ ضرورت بیچ میں ڈال دیں۔ وہ نظریہ ضرورت سالہا سال حکمرانی کرے۔ تحریکیں چلیں، جس کے نتیجہ میں بارہ چودہ جج بیٹھیں۔ وہ کہیں کہ نظریہ ضرورت کالعدم ہے۔ یہ کہنے کے باوجود جو واقعات آپ کے سامنے آئے ہیں، نظریہ ضرورت ہی ان کے پیچھے ہے۔ اس وقت اسٹیبلشمنٹ کا نظریہ ضرورت یہ ہے کہ کاروباری صنعتی طبقہ کے نمائندہ نواز شریف کی طاقت کو توڑا جائے۔ اسٹیبلشمنٹ نواز شریف کو کمزور کرنا چاہتی ہے۔ میرا مطلب ہے، اتنے ضمنی الیکشن ہوئے ہیں سب میں مسلم لیگ جیتی ہے۔ تحریک انصاف ہاری ہے۔ اس کی اتنی اہمیت "significance" نہیں ہے۔ اس لیے تمام قوتیں نواز شریف کی نااہلی اور برطرفی پر متفق ہوئی ہیں، این-اے 120 کے ضمنی الیکشن کو دیکھ لیں۔ تحریک انصاف نے کہا کہ آپ مجھے ووٹ دیں گے تو سپریم کورٹ کو ووٹ دیں گے۔ اس کے پیچھے سپریم کورٹ کا فیصلہ تھا۔ سپریم کورٹ ایک طریقے سے حصہ دار بن گئی۔ سپریم کورٹ نے جو فیصلہ کیا ہے اس کا نتیجہ ہے کہ سیاست میں اس کا نام استعمال ہوا۔

س: پاناما لیکس ایشو، جس کو بنیاد بنا کر چلتے چلتے سپریم کورٹ نے منتخب وزیر اعظم میاں نواز شریف کو نااہل قرار دیا، یہ عدلیہ کے دائرہ کار میں آتا تھا، یا یہ سیاسی ایشو تھا اور سیاسی طور پر حل ہونا چاہیے تھا؟

جواب: سپریم کورٹ نے جو آرڈر پاس کیے اور اس پر جتنی بحثیں ہوئیں اور سوالات اٹھے، اگر آپ بغور جائزہ لیں تو یہ بالکل واضح ہو جائے گا کہ یہ مسئلہ دراصل سیاسی صورتحال کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ ہمارے ملک میں جن کو عام طور پر اَن دیکھی قوتیں کہتے ہیں اور جو اَب زیادہ اَن دیکھی بھی نہیں ظاہر ہیں، اور جن کا کردار نہیں جو وہ ادا کر رہی ہیں، وہ قوتیں یہ چاہتی تھیں کہ نواز شریف اور ان کی فیملی کی سیاست آئندہ کے لیے ختم کر دی جائے۔ وہ قوتیں ہر قسم کے حربے اختیار کر لیتی ہیں۔ میں خود ایک سیاسی آدمی کی حیثیت سے مسلم لیگ ن اور نواز شریف، اور اس قسم کے دوسرے لوگوں کے خلاف ہوں، کیونکہ میری سیاست ان کے برعکس ہے، لیکن میں سیاسی طور پر لڑائی لڑتا یا لڑنا چاہتا ہوں۔ میں حیلے بہانوں سے یا ان کے خلاف فوجداری مقدموں کے ذریعے مقاصد حاصل نہیں

کرنا چاہتا۔ اُن دیکھی قوتوں نے نواز شریف کو سیاست سے نکالنے کے لیے تمام حربوں سے کام لیا۔ سننے میں آیا کہ ن لیگ کو دو حصوں میں تقسیم کر رہے ہیں جس میں نواز شریف والے گروپ کو الگ "isolate" کر دیا جائے گا اور جو باقی مسلم لیگ کا حصہ ہے وہ ان اَن دیکھی قوتوں کی سرپرستی میں ان کے مطابق سیاست کرے گا۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ سارا عمل غیر سیاسی ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ غیر سیاسی قوتوں کے سیاست کا راستہ بدلنے کے طریقے ہیں۔ یہ ہمارے ملک میں پہلی مرتبہ نہیں ہوا۔ یہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ جب بھی پاکستان کے اندر مارشل لاء لگا، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جس راستے پر سیاسی نظام چل رہا ہے، اس کو اس سے روک کر نئے اور اپنی مرضی کے راستہ پر لایا جائے۔ پاکستان کے اندر موجود سیاسی قوتوں سے کسی کو ختم کرنا، کسی کو سہارا دینا اس پراسس کا حصہ ہے۔ سیاسی پارٹیاں ویسے ہی ہمارے ملک میں کمزور ہیں، تتر بتر ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ قوتیں ان کو جوڑ کر نئی پارٹیاں بنا دیتی ہیں اور خود لمبے عرصے کے لیے بیٹھی رہتی ہیں۔ یہ ہمارے ملک کا عام تاریخی پس منظر ہے۔ وہی اس دفعہ بھی ہو رہا ہے۔ اس دفعہ اور بہت ساری پیچیدگیاں آ گئی ہیں۔ حیرت کی بات ہے، اس لیے کہ سپریم کورٹ نے مقدمہ کا آرڈر کر دیا۔ اس وقت جب یہ ہوا، میں نے کہا تھا کہ سپریم کورٹ کا یہ مقدمہ چلانے کا آرڈر اس سارے پراسس کا حصہ ہے جو سیاسی طور پر اکسایا گیا "motivated" ہے کہ نواز شریف کو تنہا کر دیا جائے۔ یہ بات کہ ایک سیاسی آدمی نے کوئی خلاف قانون کام کیا یا جرم کیا ہے، اس کے خلاف ملک کے قوانین کے مطابق مقدمہ چلانا ٹھیک ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مقدمہ کیسے چلتا ہے، تفتیش کیسے ہوتی ہے۔ مقدمہ کہاں سے شروع ہوتا اور کہاں تک جاتا ہے، مگر اس سارے سسٹم کو، قوانین کو نظر انداز کر کے عدالت نے حصہ ڈالا ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ سپریم کورٹ کے جو اس وقت 15، 16 جج ہیں، ان کی بھی رائے یہی ہوگی جو ان مقدمہ چلانے والے 5 ججوں کی ہے۔ میرے خیال کے مطابق فل کورٹ میٹنگ ضروری تھی، اس لیے کہ یہ اتنا بڑا ایشو ہے کہ پاکستان کے اندر مستقبل کی سیاست کا رُخ بدلنے والا ہے۔ اس سارے معاملے کے اوپر فل کورٹ بیٹھنا چاہیے تھی کہ اس کے اختیارات کیا ہیں؟ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے؟ خود سپریم کورٹ تضاد کا شکار ہے۔ پہلے مرحلے پر کہا یہ ہمارے دائرہ کار کا حصہ نہیں۔ یہ سیاسی معاملات ہیں۔ پھر خود ہی لے لیا۔ جب دوبارہ لیا

تو سپریم کورٹ نے حکم میں لکھا نہیں کہ پہلے کیوں مسترد کیا اور دوبارہ کیوں لیا؟ ایک تضاد جس وقت موجود ہو تو یہ سارا پراسس مشکوک ہو جاتا ہے۔ اس مشکوک پراسس کو سسٹم کے اندر حل کرنے کے لیے فل کورٹ ضروری تھی جو کسی نے نہیں بٹھائی۔ کیوں نہیں بٹھائی؟ کیا معاملات تھے؟

جو قوتیں یہ سارا کام کرنا چاہتی تھیں، انھیں کی لائن پر تمام اداروں بشمول سپریم کورٹ کے ایک مخصوص بنچ نے یہ کام کیا ہے۔ یہ بات کہنے سے مجھے کوئی باک نہیں ہے کہ سپریم کورٹ نے ان سارے حالات کے دوران جو رویہ اختیار کیا، وہ جانبدارانہ "partisan" ہے۔ وہ آزادانہ نہیں۔ جب بھی کوئی ادارہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس نے پاکستان کے حالات کو ٹھیک کرنا ہے تو وہ سیاست کا فیصلہ کرتا ہے۔ حالات کی خرابی کی بنیادی وجہ سماجی معاشی سسٹم کی خرابی ہے۔ یہ سیاست کا مسئلہ ہے۔ اگر سپریم کورٹ کے جج یہ فیصلہ کر لیں تو پھر وہ سیاسی کام کر رہے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں یہ سوچ پیدا ہوتی ہے کہ اگر ملک میں کوئی خرابی ہو جائے گی تو سپریم کورٹ ٹھیک کر لے گی۔ یہ سارے کا سارا کام پاکستان کی سیاست کو اور اس کے جمہوری عمل کو آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ سیاسی اور جمہوری عمل کئی خرابیوں سے گزرے گا، پھر ٹھیک ہوگا۔ اگر آپ اسے چلنے ہی نہیں دیں گے اور اس کے راستے سپریم کورٹ بتاتی رہے گی تو پھر سیاسی پارٹیاں چل نہیں سکتیں، کیونکہ وہ آزادی سے سوچ نہیں سکتیں۔

س: آپ کا مؤقف ہے کہ سپریم کورٹ کو یہ معاملہ نہیں لینا چاہیے تھا؟

جواب: نہیں لینا چاہیے تھے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے خود کہا کہ یہ سیاسی معاملات ہیں۔ پھر اس سے گریز کرنے کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی۔

س: میاں نواز شریف کا ٹرائل ہوا۔ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: ٹرائل تو ٹرائل کورٹ میں ہوتا ہے۔ سپریم کورٹ میں ٹرائل نہیں ہوتا۔ انصاف کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ملزم کو پورا حق دیں کہ وہ اپنا دفاع کرے۔ اگر گواہ ہیں تو وہ آزادانہ گواہی دیں۔ کسی کو تنگ نہ کیا جائے۔ جوائنٹ انویسٹی گیشن ٹیم تو زیادہ سے زیادہ ایک تھانیدار کا کردار ادا کر رہی تھی۔ وہ بھی مشکوک بات ہے کہ آپ نے اس کے اندر، وہ ادارے جن کا انویسٹی گیشن سے کوئی تعلق نہیں، ان کو بھی بیچ میں جوڑ دیا۔ چلیں جوڑ دیا، پھر اس کے اوپر ایک جج بٹھا دیا۔ ٹرائل تو ہوا ہی نہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ اثاثہ کی تعریف کیا ہے؟ یہ سب مانتے ہیں کہ اثاثہ کی واضح تعریف موجود نہیں ہے۔ اب آپ کہہ دیں کہ ایک آدمی کسی کی کمپنی کا ڈائریکٹر بن گیا۔ اس کی تنخواہ مقرر ہے 10 یا 50 ہزار۔ وہ لیتا نہیں ہے۔ وہ اثاثہ ہے۔ وہ کہتا ہے، میرے بیٹے کی کمپنی ہے۔ میں ڈائریکٹر بن گیا ہوں۔

میرا نام لکھا ہوا ہے۔تنخواہ نہیں لیتا۔ مجھے آ کے کئی لوگ کہتے ہیں کہ جی آپ معتبر آدمی ہیں۔آپ کو ہم ڈائریکٹر بناتے ہیں۔آپ اعزازی ہیں۔نواز شریف کے بیٹے کی کمپنی ہے۔انھوں نے تنخواہ نہیں لی۔وہ بھی کوئی اثاثہ مان لیتا اگر کوئی ثبوت ہوتا۔کمپنی کے گوشواروں میں لکھا ہوتا کہ یہ نواز شریف کی تنخواہ ہے جو ہم نے ان کے نام پر رکھ دی ہے۔جب وہ چاہیں لے سکتے ہیں۔گوشواروں میں ایسی کوئی بات نہیں۔پھر یہ کہنا کہ نواز شریف نے گوشواروں میں تنخواہ کو اثاثہ ظاہر نہیں کیا۔ ڈکلیریشن نہ دینا یا کوئی چیز نکال دینا، یا کوئی چیز بیان نہ کرنا، اس پر آپ کو ثابت کرنا پڑے گا کہ کس مقصد کے لیے کیا گیا۔کیا یہ مقصد تھا کہ حکومتی اداروں سے فراڈ کر کے گوشوارے پاس کرائے جائیں؟ ایسا تو کچھ نہیں ہوا۔اگر یہ الزام لگاتے، ان کا ٹرائل کرتے، وہ دفاع کرتے، گواہ پیش کرتے، کچھ کرتے۔اب جب مقدمے نیب کورٹس میں گئے ہیں، ان کے اوپر بھی پابندی ہے کہ 6 مہینے کے اندر فیصلے کیے جائیں۔اخبار میں نیب والوں کا بیان پڑھ رہا تھا کہ ہم کوئی انویسٹی گیشن اپنے اختیار کے مطابق نہیں کریں گے، کیونکہ ہمارے اوپر پابندی ہے کہ 6 مہینے کے اندر اور جے- آئی- ٹی رپورٹ کی بنیاد کے اوپر فیصلے ہوں۔اگر آپ کسی کو سزا دے کے جیل بھیجنا چاہتے ہیں تو ملک کا جو قانون نافذ ہے، اس کے مطابق یہ کریں۔قانون کو چھوڑ کر آپ اپنی مرضی نہیں کر سکتے، اگر آپ قانون سے ہٹ کر کریں گے تو صاف ظاہر ہوگا کہ آپ اپنی مرضی کے نتائج چاہتے ہیں۔☆......☆

گنے کی کاشت: قیمتوں کا بحران اور حل

تحریر: اثر امام

گنا پاکستان کی اہم ترین زرعی اجناس میں سے ایک ہے اس کی کاشت خاص طور پر چینی کی پیداوار کے لیے کی جاتی ہے لیکن گنے کی بائی پراڈکٹس بھی بہت زیادہ اور متنوع ہیں۔مثال کے طور پر اس کا استعمال کیمیکلز اور رنگ سازی میں بھی ہوتا ہے اور چھوٹے بچوں کے لیے ٹافیاں اور دیگر کینڈیز بھی گنے کی کاشت کی مرہون منت ہیں یہی نہیں بلکہ چپ بورڈ کاغذ اور گتہ وغیرہ بھی اس کی بائی پراڈکٹس ہیں۔

پاکستان میں دس لاکھ ہیکٹر سے زیادہ رقبے پر گنے کی کاشت کی جاتی ہے جس میں پنجاب کا حصہ ۶۲، سندھ کا ۲۶ اور خیبر پختونخوا کا ۱۶ فیصد ہے۔ملک میں گنے کی کاشت کے لیے استعمال ہونے والے رقبے میں اضافہ ہوتا رہا ہے لیکن فی پیداوری یونٹ کے لحاظ سے کچھ خاص اضافہ دیکھنے میں نہیں آیا اور تو اور ہم اس سلسلے میں گنا پیدا کرنے والے دیگر ممالک کے ساتھ مقابلہ بھی نہیں کر سکتے مثال کے طور دنیا میں گنے کی پیداوار فی ہیکٹر تقریباً ساٹھ میٹرک ٹن ہے ہندوستان میں یہ پیداوار ۶۶ میٹرک ٹن فی ہیکٹر جبکہ مصر میں تو اس سے بھی کہیں زیادہ یعنی ۱۰۵ میٹرک ٹن فی ہیکٹر پیداوار حاصل کی جا رہی ہے لیکن پاکستان میں ہم فی ہیکٹر ۴۵ یا ۵۰ ٹن سے زیادہ پیداوار نہیں لے پاتے۔تعجب کی بات یہ ہے کہ مصر کو تو جانے دیں ہندوستان جس کی زمین اور آب و ہوا میں ہماری زمین اور آب و ہوا سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہے وہ بھی ہمارے مقابلے میں ۵۳ فیصد زیادہ پیداوار لے رہا ہے۔

پاکستان دنیا کا پانچویں نمبر کا ملک ہے جس میں گنے کی کاشت بہت زیادہ رقبے پر کی جاتی ہے جبکہ پیداوار کے لحاظ سے پاکستان کا نمبر ۱۵واں ہے یعنی گنے کی کاشت سے زیادہ پیداوار لینے والے ممالک میں پاکستان پندرھویں نمبر پر آتا ہے پاکستان میں فی من گنے سے چینی کی پیداوار 9.2 کلوگرام ہے اس حساب سے اگر ایک من گنے سے نو کلوگرام چینی پیدا ہوتی ہے تو کارخانے دار کو کم از کم ۴۵۰ روپے آمدنی ہوتی ہے۔یہ وہی ایک من گنا ہے جس سے سرمایہ دار خود تو ۴۵۰ روپے کماتا ہے لیکن گنا پیدا کرنے والوں کو اس ایک من کے عوض ۱۸۲ روپے بھی دینے کو تیار نہیں ہوتا۔گنے کی بائی پراڈکٹس کا تو حساب ہی نہیں۔

پاکستان میں ایک ہیکٹر زمین پر گنے کی کاشت کے نتیجے میں بالعموم ۴۷ ٹن گنا پیدا ہوتا ہے پیداوار کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سندھ سب سے آگے ہے جس میں فی ہیکٹر ۵۳ ٹن گنا پیدا ہوا ہے جبکہ پختونخوا میں ۴۵ ٹن اور پنجاب میں ۴۰ ٹن فی ہیکٹر پیداوار ہے یعنی گنے کی کاشت کے رقبے کے لحاظ سے پنجاب سب سے آگے اور پیداوار کے لحاظ سے سندھ نمبر ایک پر ہے۔

گنے کی کاشت کے حوالے سے عالمی معیار کا کوئی تحقیقاتی ادارہ ہمارے پاس نہیں ہے اور نہ زراعت کے نام پر موجودہ سرکاری ادارے اتنی اہلیت رکھتے ہیں کہ وہ بین الاقوامی معیار کا کوئی کام کر سکیں جس کے نتیجے میں نہ تو نئے بیجوں پر

کام ہورہا ہے اور نہ جدید طریق کاشت سے فائدہ اٹھایا جارہا ہے اور نہ فصل کے لیے مضر جرثوموں سے جان چھڑائی سکتی ہے۔ گنے کو مناسب اور کم از کم وقت میں شوگر ملوں تک پہنچانے اور گنے سے رس نکالنے کا عمل مختصر نہیں کیا جارہا اسی طرح موسمی اثرات سے تحفظ کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں۔ گنے کی فصل تیار ہونے پر شوگر ملز مالکان کی طرف سے مناسب نرخ نہ دیے جانے کا مسئلہ بھی عارضی نہیں بلکہ مستقل ہے اس کے علاوہ تقریباً ہر سال یہی منظر دیکھنے کو ملتا ہے کہ شوگر ملز کے باہر گنے سے بھرے سینکڑوں ٹرک اور ٹریکٹر کئی کلومیٹرز تک قطار میں کھڑے رہتے ہیں اور انہیں فارغ نہیں کیا جاتا حالانکہ شوگر ملز مالکان کی حکمت عملی تو یہی ہوتی ہے کہ اس طرح وہ اپنے من پسند نرخ پر گنا خریدے لیکن اس سے ملک وقوم کا نقصان بھی ہورہا ہے وہ اس طرح کہ وقت پر مل تک نہ پہنچنے کی وجہ سے گنا چینی کی اتنی پیداوار نہیں دیتا جو کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں لی جارہی ہے۔

پاکستان میں گنے کی فصل جوں ہی تیار ہوتی ہے تو حکومت کی طرف سے گنے کے نرخ مقرر کیے جاتے ہیں گو کہ اعلان کردہ نرخوں پر مل مالکان کی طرف سے عملدرآمد نہیں ہوتا کیونکہ بہرحال مل مالکان حکومت سے زیادہ طاقت ور ہیں جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ملک میں موجود شوگر ملز زیادہ تر حکمرانوں کی ہی ملکیت ہیں لہذا مل مالکان عوام کے منتخب نمائندے ہونے کی حیثیت میں گنے کے نرخ مقرر کرتے ہیں لیکن چونکہ وہ مل مالکان بھی ہیں لہذا کسانوں اور کاشتکاروں کی لوٹ کھسوٹ بھی ان کا فرض منصبی ہوتا ہے چنانچہ نرخوں پر عمل درامد نہیں ہوتا لیکن اگر نرخوں پر عمل درآمد بھی ہو تو ہمیں تسلی نہیں ہوگی کیونکہ ہم اس کے بعد بھی تنقیدی ہیں وہ اس لیے کہ جو بے خبر ہے سو بے خبر ہے لیکن جو خبردار ہے اسے معلوم ہے کہ گنے کی کاشت کرنے والے کئی طرح کے بیج استعمال کرتے ہیں اور پیداوار کا معیار بھی ایک سا نہیں ہوتا اس لیے گنے کی قیمت ایک سی کیسے ہوسکتی ہے اسی طرح شوگر ملز کی ٹیکنالوجی اور قابلیت بھی ایک جیسی نہیں چنانچہ یہ تو ٹھیک ہے کہ سرکار گنے کی فی من کم سے کم قیمت مقرر کرے لیکن اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہر قسم کا گنا اسی کم از کم قیمت پر خریدا جائے گا یہ ایسا ہی ہے جیسے کم از کم اجرت کا قانون جو حکومت اس لیے نافذ کرتی ہے کہ محنت کشوں کو فائدہ پہنچانا مقصود ہوتا ہے بلکہ اس لیے تاکہ زیادہ سے زیادہ محنت کشوں کو کم از کم اجرت پر کام کرنے کے لیے مجبور کرنے کے عمل کو قانونی شکل دی جاسکے۔

کراچی میں گنے کی کاشت سے متعلق کسانوں اور آبادگاروں کو قیمتوں کے معاملے پر احتجاج کرتے ہوئے مارا پیٹا گیا جس کے بعد اس معاملے نے ملکی میڈیا کی توجہ حاصل کر لی لیکن اس قدر بھی نہیں کہ حکمرانوں کو اس بنا پر یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل کرنا پڑ جاتا ہمیشہ کے لیے تو خیر مسئلے کا عارضی حل بھی نہیں نکالا گیا۔ سندھ کے وزیر زراعت نے بجائے اس کے کہ معاملہ کی سنگینی کا ادراک کرتے ہوئے کسانوں کے زخموں پر مرہم لگانے کی سوچتا اس نے الٹا ان کے زخموں پر نمک پاشی کی جس کی وجہ بھی صاف ظاہر ہے کہ سندھ میں زیادہ تر شوگر ملیں آصف زرداری کی ملکیت ہیں جو ان کے فرنٹ مین انور مجید کے ذریعہ چلائی جاتی ہیں لہذا پیپلز پارٹی کی حکومت کا ایک ادنیٰ سا صوبائی وزیر بھلا اتنا جرات کہاں سے لاتا کہ اس معاملے پر زرداری صاحب کی ناراضگی مول لیے ہوئے کسانوں اور آبادگاروں کے ساتھ کھڑا ہو کر حق سچ کا ساتھ دیتا اور سرخرو بن جاتا۔

اس موقع پر یہ سوال بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ان حالات میں کسانوں اور آبادگاروں کو کیا کرنا چاہیے؟ کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟ جواب یہ ہے کہ راستہ تو ایک ہی ہے مزاحمت کا راستہ۔ اپنے آپ کا اظہار کرنے کا راستہ۔ کسانوں اور آبادگاروں نے دیکھ لیا کہ ان کے احتجاج کے نتیجے میں حکومت مجبور ہوئی کہ ان سے مذاکرات کرے۔ اسی طرح اگر کسانوں کا احتجاج زیادہ منظم اور مضبوط ہوتا تو کسان اپنی پسند کے نرخ بھی حاصل کر سکتے تھے آئندہ بھی اگر کسان منظم اور متحد ہوں گے تو ان کے حالات سدھر سکتے ہیں۔ قاری کو علم ہے کہ جب کامریڈ حیدر بخش جتوئی نے کسانوں کو منظم کیا اور انہیں احتجاجی تحریک کا حصہ بنایا تو جاگیرداروں کی اسمبلی نے مجبور ہو کر کسانوں اور مزارعوں کے حق میں سندھ ٹیننسی ایکٹ منظور کیا تھا تاہم جتنا کسانوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ منظم ہوں اس سے زیادہ نہیں یہ ان سیاسی جماعتوں کی ذمہ داری بنتی ہے جو محنت کش طبقات کی سیاست کرنے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں کہ کسانوں کی تنظیم کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کریں۔ پاکستان میں بایاں بازو خواہ جس حالت میں بھی ہے اس کی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ محنت کشوں، کسانوں، صنعتی مزدوروں اور دیگر پسے ہوئے طبقات کے حقوق کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیں۔ ان کی نمائندگی کریں انہیں قیادت فراہم کریں اور جب ان محنت کشوں کے خلاف ریاستی جبر کا استعمال ہو تو محنت کشوں کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے فقط اس صورت میں محنت کش ہماری سیاست کو اپنی سیاست سمجھیں گے۔ فقط اسی صورت میں ہمارا یہ دعویٰ درست قرار پائے گا کہ ہم محنت کشوں کے دوست اور ان کے حقیقی نمائندے ہیں۔

☆☆

نیپال میں کمیونسٹوں کی فتح ۔نئی تاریخ رقم کردی

تحریر: فاروق طارق

نیپال میں عام لوگ کمیونسٹ الائنس کی جیت سے بے تحاشہ خوش ہیں۔ان کی خواہش تھی کہ ایک عوام دوست مضبوط و مستحکم حکومت اقتدار میں آئے اور ان کی زندگی میں بنیادی تبدیلیاں لانے کا باعث بنے اور وہ خواہش اب پوری ہوتی نظر آ رہی ہے۔

کمیونسٹ پارٹی نیپال (یونائٹڈ مارکسسٹ لیننسٹ)یعنی UML اور کمیونسٹ پارٹی نیپال (ماؤسٹ سنٹر) پر مشتمل لیفٹ الائنس نے 165 سیٹوں کے لیے فرسٹ پاسٹ دی پوسٹ (FPTP) سسٹم کے تحت ہونے والے انتخابات میں 116 پر کامیابی حاصل کر لی جبکہ حکمران جماعت نیپالی کانگریس صرف 23 سیٹیں جیت سکی۔دو اور چھوٹی جماعتوں نے بھی ایک ایک سیٹ جیت لی ۔یوں بائیں بازو نے 2015 کے نئے آئین کے تحت ہونے والے عام انتخابات میں تقریباً دو تہائی اکثریت حاصل کر لی۔

سات صوبائی انتخابات میں لیفٹ الائنس نے کل 330 میں سے 241 سیٹیں جیتی ہیں جن میں سے UML نے 167 اور ماؤسٹوں نے 74 سیٹیں جیتی ہیں کانگریس نے تمام سات اسمبلیوں میں صرف 41 سیٹیں جیتیں۔

فیڈرل ڈیموکریٹک ری پبلک آف نیپال میں عام انتخابات دو مرحلوں پر 26 نومبر اور 7 دسمبر 2017 کو منعقد ہوئے۔یہ انتخابات ہاؤس آف ریپریزنٹیٹوز (عوامی نمائندگی کا ہاؤس) یعنی فیڈرل پارلیمنٹ کے کل 275 اراکین کے لیے منعقد ہوئے ان میں سے 165 کا براہ راست حلقہ بندیوں کے ذریعے انتخاب ہوا یعنی جس نے ایک حلقے میں سب سے زیادہ ووٹ لیے وہ کامیاب ہوا۔اسے انگلش میں First past the post (F.P.T.P) سسٹم بھی کہا جاتا ہے اس کے لیے ہر ووٹر کو دو بیلٹ پیپرز دیئے گئے تھے ایک پر اپنے حلقے کے امیدوار کا ووٹ اور دوسرا اپنی پسند کی پارٹی کا ووٹ۔بقیہ 110 سیٹوں کا متناسب نمائندگی کے ذریعہ انتخاب ہوا جس میں UML نے 77 اضلاع میں سے 76 کی کاؤنٹنگ میں 3,161,295 ووٹ لیے ہیں جبکہ نیپالی کانگریس نے تقریباً 3,111,643 ووٹ حاصل کر کے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ پشپا کمال دھرجو پراچندہ کے نام سے مشہور ہیں کے ماوسٹ سنٹر نے بھی 1,295,903 ووٹ حاصل کیے جبکہ مہادیشی پارٹیوں کے الائنس فیڈرل سوشلسٹ فورم نیپال نے 469,461 اور راشٹریہ جنتا پارٹی نے 470,486 ووٹ حاصل کیے ہیں انتخابات سے قبل یہ طے ہو گیا تھا کہ جو پارٹی متناسب نمائندگی کے تحت ڈالے جانے والے ووٹوں کا تین فیصد حاصل کرے گی اسے سیٹ ملے گی ان انتخابات میں اب پانچ پارٹیوں نے تین فیصد سے زائد ووٹ حاصل کیے ہیں۔

ان کے علاوہ صوبائی اسمبلیوں کی 330 سیٹوں پر بھی انتخابات کا انعقاد ہوا ان میں کمیونسٹوں نے شاندار کامیابی حاصل کی ہے نئے تشکیل پانے والے سات صوبوں میں سے چھ میں لیفٹ الائنس حکومت تشکیل دے گا صرف ایک صوبہ جو انڈیا کے ساتھ منسلک ہے وہاں پر ایک اور الائنس کی حکومت ہوگی چھ صوبوں میں یو ایم ایل نے شاندار کامیابی حاصل کی ہے صوبائی اسمبلیوں میں متناسب نمائندگی کے ذریعے مزید 220 سیٹوں پر انتخاب ہوگا۔

ان انتخابات میں اوپن سیٹوں پر صرف پانچ عورتوں نے کامیابی حاصل کی ہے جبکہ نیپال کا نیا آئین اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ پارلیمنٹ کی کل 275 سیٹوں میں عورتوں کی تعداد اس کا ایک تہائی ہوگی یعنی موجودہ پارلیمنٹ میں کل ممبران میں عورتوں کی تعداد 91 ہوگی اس وقت صرف پانچ خواتین جیتی ہیں۔ بقیہ کو آئین کے تحت متناسب نمائندگی کے ذریعے پورا کرنا لازمی ہے ورنہ سپریم کورٹ ان انتخابات کو غیر آئینی قرار دے سکتی ہے متناسب نمائندگی کے تحت اب کل 110 میں سے 86 ممبران عورتیں ہونا لازمی ہے جس کے لیے سیاسی پارٹیوں نے الیکشن کمیشن کو اپنی لسٹیں پہلے ہی جمع کرا رکھی ہیں۔

متناسب نمائندگی کے تحت ان انتخابات میں 88 سیاسی پارٹیوں نے حصہ لیا ان انتخابات میں تین انتخابی الائنس حصہ لے رہے تھے ایک کمیونسٹوں کا' دوسرا ڈیموکریٹس کا جس کی قیادت حکمران نیپالی کانگریس کر رہی تھی اور تیسرا مدیشی (Madhes) پارٹیوں کا ان میں کمیونسٹ الائنس نے تاریخی کامیابی حاصل کی۔

اگرچہ نیپالی کانگریس نے اکتیس لاکھ سے زیادہ ووٹ لیے لیکن لیفٹ الائنس کی تشکیل سے انتخابات میں روایتی طور پر ووٹ تین حصوں میں تقسیم ہونے کی بجائے دو حصوں میں بٹے جس کا بنیادی فائدہ لیفٹ الائنس کو ہوا اور کانگریس کو تاریخی شکست ہوئی۔

ان انتخابات میں کانگریس پارٹی کو بھارت دوستی کا بھاری مول چکانا پڑا

ہے جبکہ کمیونسٹ پارٹیاں چین کے ساتھ بھی تعلقات رکھنے پر زور دے رہی تھیں کمیونسٹ بھارتی بالادستی کے خلاف مہم چلاتے رہے۔ مودی حکومت کے حامیوں کو نیپال کے معاشی بائیکاٹ کی بھاری قیمت چکانی پڑی مودی حکومت نے تو یہ کوشش بھی کی کہ نیپال کے آئین سے سیکولر کا لفظ بھی نکال دیں اور اس کے لیے حکومت پر زور بھی ڈالا گیا مگر اس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی۔

بھارت کی جانب سے نو ماہ تک جاری رہنے والے اس معاشی بائیکاٹ میں سب سے بڑا مسئلہ تیل کا تھا۔ جو بھارت سے ہی بذریعہ سڑک آتا تھا۔ نیپال میں تیل ناپید ہوگیا تھا سڑکیں ٹریفک سے خالی ہوگئی تھیں، موٹر سائیکل سواروں کی تین تین کلومیٹر طویل قطاریں لگنی شروع ہوگئی تھیں حکومت نے اس دوران قطر سے تیل سے بھرے بوئنگ طیارے منگوا کر اس بھارت میڈ تیل قحط کو دور کرنے کی کوشش کی انتخابات میں بھارت کی حامی سمجھی جانے والی کانگریس کو تاریخی شکست کا سامنا کرنا پڑا محنت کش عوام نے اپنی باری آنے پر بھارت نواز حلقوں کو بری طرح مسترد کر دیا۔

یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ نیپال میں کمیونسٹوں کو اتنی بڑی کامیابی ملی ہے انہیں حکومت بنانے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ساؤتھ ایشیا میں نیپال سب پر بازی لے گیا ہے ایک سیکولر آئین کے ذریعے کمیونسٹ نام کے ساتھ لیفٹ الائنس کے ذریعے دو تہائی اکثریت دنیا کی حالیہ تاریخ میں ایک نیا باب ہے اس جیت کے نہ صرف ساؤتھ ایشیا میں بلکہ دنیا بھر میں زبردست مثبت اثرات ہوں گے۔

بائیں بازو کی جانب سے انتخابات سے قبل الائنس کی تشکیل کی صورت میں جو حکمت عملی اختیار کی گئی' وہ انتہائی کامیاب رہی' دونوں جماعتوں میں کل سیٹوں پر 60/40 کے تناسب سے امیدوار کھڑے کرنے پر اتفاق ہوا تھا یو ایم ایل کو ساٹھ فیصد نشستیں ملی تھیں جبکہ ماؤسٹوں کو چالیس فیصد ملیں۔ یو ایم ایل نے اس فارمولے کے تحت فیڈرل سطح پر 90 امیدوار کھڑے کئے جن میں سے 80 نے کامیابی حاصل کرلی۔ یہ بھی طے پایا ہے کہ دونوں کمیونسٹ پارٹیاں ایک دوسرے میں اگلے چھ ماہ کے دوران ضم ہوجائیں گی اور ایک مضبوط اور مستحکم پارٹی تشکیل دیں گی۔

کھٹمنڈو شہر کی کل دس سیٹوں میں سے چھ سیٹوں پر یو ایم ایل نے کامیابی حاصل کی۔ ہارنے والی چار سیٹوں پر ماوسٹ سنٹر نے امیدوار الائنس فارمولے کے تحت کھڑے کیے تھے جو جیت نہ سکے۔

ان انتخابات میں یو ایم ایل نے اپنے جنرل سیکریٹری KP OLI کی قیادت میں حصہ لیا جو اب وزیراعظم بنیں گے وہ ایک سینئر کمیونسٹ رہنما ہیں جو تیرہ سال کی عمر سے اس تحریک سے وابستہ ہوگئے تھے وہ انڈین کمیونسٹ رہنما چارو موجمدار کی طرز پر نیپال میں کمیونسٹ پارٹی کی تعمیر کرنا چاہتے تھے بادشاہت کے دور میں وہ تیرہ سال قید میں رہے ان کی قربانیوں کی ایک لمبی داستان ہے وہ ماضی میں مختلف اہم وزارتوں کے علاوہ وزیراعظم بھی رہ چکے ہیں۔

بائیں بازو اور کمیونسٹوں کی نیپال میں سیاست پر کنٹرول کا یہ عالم ہے کہ اس وقت پانچ ایسے سابق وزیراعظم زندہ ہیں جن کا تعلق کمیونسٹ پارٹیوں سے تھا ان میں مدھن نپل پشپا کمل دھر اور اولی بھی شامل ہیں۔)

بنیادی سماجی تبدیلی کمیونسٹوں کے لیے بہت بڑا چیلنج

نیپال میں انتخابات کے فوری بعد مجھے پانچ روز کھٹمنڈو میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا۔ اس دوران بے شمار عام نیپالیوں سے بات چیت رہی۔ تقریباً تمام ہی یو ایم ایل کے ووٹر تھے۔ بنکاک سے کھٹمنڈو آتے ہوئے ساتھ والی سیٹ پر ایک نیپالی خاتون انجینئر براجمان تھی جو برما میں ایک کانفرنس میں شرکت کرکے واپس آرہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہم پروفیشنل لوگوں کی اکثریت نے بھی یو ایم ایل کو ووٹ ڈالے ہیں۔ کیونکہ ہم ایک مستحکم حکومت چاہتے ہیں وہ پہلے کانگریس کی ووٹر تھیں۔

نیپالی کمیونسٹ کوئی روایتی کمیونسٹ نہیں ہیں وہ ایک پارٹی سسٹم اور آمریت پر یقین نہیں رکھتے۔ انہیں آپ لیفٹ سوشل ڈیموکریٹس بھی کہہ سکتے ہیں نیپالی کانگریس نے انتخابات سے قبل جو پراپیگنڈا کیا وہ یہ تھا کہ یہ روایتی کمیونسٹ ہیں۔ نیپال میں آمریت اور ایک پارٹی سسٹم کو فروغ دیں گے وغیرہ وغیرہ مگر چونکہ عوام کا ان سے تجربہ بھی تھا اور یہ پراپیگنڈا حقائق کے برخلاف تھا لہٰذا عوام کی اکثریت نے اس جھوٹے پراپیگنڈا کا جواب یو ایم ایل کی قیادت میں الائنس کو مزید ووٹ دے کر دیا۔

انتخابات میں کمیونسٹوں کی اس بڑی کامیابی سے نیپالی عوام کی امید کی کرنیں دوبارہ جاگی ہیں۔ یہ کمیونسٹ الائنس کا ایک بڑا ٹیسٹ بھی ہے ایک چیلنج بھی ہے۔ کیا وہ ساؤتھ ایشیا کے اس غریب ترین ملک میں غربت کا خاتمہ کرکے اور عوام کے تمام بنیادی جمہوری' معاشی اور سیاسی و سماجی حقوق کو پورا کرتے ہوئے اگلے پانچ سال میں ایک نئی تاریخ رقم کریں گے یہ دیکھنا ابھی باقی ہے عوام نے اپنا حق ادا کر دیا ہے اب گیند کمیونسٹوں کے کورٹ میں ہے۔

☆☆☆

دنیا کی پہلی اشتراکی ریاست کے قیام میں عورتوں کا کردار

تحریر: صالحہ اطہر

انقلاب روس کی سوویں سالگرہ دنیا بھر میں بہت زور و شور سے منائی جارہی ہے سب کی کوشش ہے کہ اس وقت کے حالات اور واقعات پر روشنی ڈالی جائے تا کہ دنیا کے سامنے انقلاب کی جدوجہد کو ظاہر کیا جائے اور یاد کیا جارہا ہے کہ ملک روس میں انقلاب سے پہلے سیاسی و معاشی اور سماجی حالات کیا تھے وہاں کے عوام کن مشکلات کا شکار تھے۔ زار روس کا تختہ کیوں الٹا گیا؟ ان کوششوں میں کس طرح کی تحریکیں وجود میں آئیں اور کن طبقوں نے اس میں حصہ لیا یہ بھی ذکر ہورہا ہے کہ زیادہ تر مزدور کسان طالب علم عورتیں اور دانشور پیش پیش رہے جن کی جدوجہد اور انقلابی سوچ نے انقلاب کے لیے راہ نکالی تمام پہلوؤں کی تفصیل اجاگر کی جارہی ہے۔

اس دوران عورتوں کا سوال بھی آیا کہ کیا عورتیں اس جدوجہد میں شامل رہیں؟ اگر ہاں تو کس طرح؟

عورتیں دنیا بھر میں کم اجرت پر کام کرنے والی مانی جاتی ہیں۔ جہاں جہاں سرمایہ داری نظام ہے وہاں سب سے زیادہ عورتیں کم اجرت پر زیادہ اوقات میں زیادہ کام پر دستیاب ہوتی ہیں اسی طرح روس کی عورتیں بھی اس نظام کا شکار تھیں اور یہاں کی عورتیں بھی گارمنٹ فیکٹریز میں کام کرتی تھیں۔ اپنے مسائل سے نجات کے لیے مستقل جدوجہد کررہی تھیں ان عورتوں کے مطالبات تھے کہ

☆...... **ان کی اجرت مرد مزدوروں کے برابر کی جائے۔**

☆...... **کام کے اوقات آٹھ گھنٹے کیے جائیں**

☆...... **ہفتہ میں ایک دن چھٹی دی جائے**

☆...... **زچگی کے دوران تنخواہ کے ساتھ چھٹی دی جائے**

☆...... **اجرت ضروریات کے مطابق رکھی جائے کام کی جگہ محفوظ بنائی جائے۔**

اور دیگر مطالبات بھی رکھے گئے تھے۔

فیکٹریوں میں کام کرنے والی عورتیں دنیا بھر میں جدوجہد کررہی تھیں جن میں امریکہ کی عورتیں بھی پیش پیش تھیں۔ یہ مطالبات صرف روس کی عورتوں ہی کے نہیں تھے بلکہ دنیا بھر میں جہاں عورتیں مختلف فیکٹریوں میں کام کررہی تھیں وہ سب ان مسائل کا شکار تھیں کیونکہ یہ مطالبات دنیا بھر میں نہیں مانے جارہے تھے اس لیے ہڑتالیں دنیا میں ہر جگہ جاری تھیں دنیا کے بیشتر شہروں میں مظاہرے ہورہے تھے روس میں بھی مظاہرے اور ہڑتالیں جاری تھیں۔

ایک سو سال قبل 23 فروری 1917 کو پچاس ہزار عورتیں فیکٹریوں سے سڑکوں پر نکل آئیں۔ روس کے انقلاب کی حمایت میں اور زار کی حکومت کے خلاف مظاہرہ کیا گیا تھا یہ دن عورتوں کا عالمی دن تھا جو دنیا میں پہلی مرتبہ روس میں منایا جارہا تھا۔ روس کا یہ مظاہرہ ایک بہت بڑا انقلابی مظاہرہ تھا جس میں روس کی ٹیکسٹائل ورکر عورتوں کی طرف سے زار کی حکومت کی طرف سے ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کے خلاف ہڑتال کی کال دی تھی۔ اس تحریک میں نہ صرف عورتیں بڑی تعداد میں تھیں بلکہ مرد مزدور اور تمام عوام شامل تھے یہ سب تبدیلی چاہتے تھے انقلاب چاہتے تھے۔

عورتیں بھی تبدیلی چاہتی تھیں کیونکہ وہ معاشرے کا پسا ہوا طبقہ گردانی جاتی تھیں جس کے پاس تعلیم ہے نہ ہنر صرف ایک مشین کا پرزہ بن کررہ گئی تھیں۔ وہ فرسودہ رسومات پدرسری نظام کی آلہ کار بن گئی تھیں جس کو کوئی حقوق حاصل نہیں تھے اگر فیکٹری میں کام کرتی ہے تو کم اجرت پر جہاں اس کو زیادہ سے زیادہ کام کرنا پڑتا تھا۔ علاج معالجہ کا کوئی انتظام نہیں تھا کسمپرسی کی زندگی گزار رہی تھی فرسودہ رسم و رواج کے تحت عورتوں پر پابندیاں عائد تھیں باہر نکلنے پر پابندی تھی ایک خاص قسم کے لباس کی پابندی تھی یہ لباس عبایہ کی شکل کا ہوتا تھا جو پورے جسم کو ڈھانپتا تھا جس کے ساتھ سر کو ڈھانپنے کے لیے ایک ٹوپی ہوتی تھی کم عمری کی شادی کا رواج تھا عورتیں ذہنی و جسمانی دباؤ کا شکار تھیں عموماً مسائل وہی تھے جن سے جنوبی ایشیا اور دوسرے غیر ترقی یافتہ ممالک کی عورتیں متاثر ہوتی ہیں۔

مزدور عورتیں متحد ہوکر اس استحصالی نظام کے خلاف آواز اٹھاتی رہیں مگر طاقت کے ذریعے ان کی آواز دبادی جاتی یا پھر ملازمتوں سے نکال دی جاتیں تھیں کیونکہ ملک میں کوئی قانون نہیں تھا یا سیاسی نظام نہیں تھا کہ ان کو انصاف فراہم کرتا۔

سرمایہ داری نظام کی وجہ سے عورت مزدور کو کمزور کر کے طور پر مانا جاتا تھا

عورتیں گا ہے بہ گا ہے اپنے مسائل کے لیے ہڑتال اور مظاہرے کرتیں تھیں ان ہڑتالوں میں صرف ورکرز عورتوں کے کام کے مسائل ہی نہیں تھے بلکہ معاشرے میں ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور فرسودہ رسم ورواج سے چھٹکارے کی جدوجہد بھی شامل تھی لیکن یہ سب زار کی حکومت میں ناممکن تھا اس کے لیے حکومت کے خلاف آواز اٹھانے کی ضرورت تھی کچھ انقلابی سوچ رکھنے والی عورتوں نے یہ بیڑہ اٹھایا جن کے نام یہ ہیں:

Alexandra Kollontai, Inessa Armand اور Nadezhda Krupskaya انہوں نے ورکرز عورتوں کو منظم کرنا شروع کر دیا کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ جب تک عورت مرد کے ساتھ انقلاب کی جدوجہد میں شامل نہیں ہوتی انقلاب نہیں آسکتا۔ اس کے لیے تربیتی مراکز قائم کیے گئے شروع میں فیکٹری ورکرز کی تعداد کم شامل ہوئی زیادہ تر صرف اپنے فیکٹری کے کام سے واقف تھیں ان کو انقلاب سے کوئی سروکار نہ تھا ان عورتوں کے ساتھ زیادہ محنت سے کام کرنے کی ضرورت تھی آہستہ آہستہ تربیت نے کام دکھایا۔ بیس عورتوں کے سرکل 1890 تک قائم ہوگئے جس میں جدوجہد کرنے اور اپنی آواز کو بلند کرنے کی تربیت دی گئی۔ اپنے ساتھ پیش آنے والے مسائل پر بھی بحث ہوتی تھی ان سے نجات کے لیے لائحہ عمل تیار کیا جاتا تھا اس کا مقصد انقلاب کے لیے مزدور عورت کو تیار کرنا اور ساتھ ہی ان کو اپنے ساتھ ہونے والے تشدد کے بارے میں آگہی دینا ہوتا تھا۔ ان تربیتی مراکز میں مظاہرے، ہڑتالیں منظم کرنے کی بھی تربیت دی جاتی تھی ساتھ ساتھ انقلابی سوچ کو بھی اجاگر کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے عورتیں بالشویک پارٹی کی طرف جانے لگیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ زار کی حکومت ان کے مسائل میں اضافہ کر رہی ہے انصاف نہیں مل سکتا۔ زار کے زمانے میں مزدور عورتیں ایک استحصال زدہ مجبور طبقے کی حیثیت رکھتی تھیں۔

اس سے نجات کے لیے اپنے آپ کو اور تمام ورکرز عورتوں کو منظم کرنے لگیں ۔ اس طرح طبقاتی شعور بھی بڑھنے لگا اور بڑے پیمانے پر مزدوروں کا احتجاج بڑھنے لگا۔ ریلیاں، ہڑتالیں ہونے لگیں اس کے نتیجہ میں 1890ء میں مزدوروں کی ایک بڑی ہڑتال ہوئی جو دو ہفتے جاری رہی۔ لیکن پھر بھی عورتوں کی تعداد بہت کم تھی اس ہڑتال کے بعد عورتوں نے اپنے آپ کو اس جدوجہد سے دور کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ وہ بہت جلد مایوسی کا شکار ہوگئی تھیں مزدور لیڈر دس سال تک ان عورتوں کو منظم کرتے رہے تربیتی مراکز میں عورتوں کی تربیت کرتے رہے تا کہ انقلاب کی جدوجہد میں یہ اپنا مثبت رول ادا کر سکیں دیکھا جائے تو یہ پھر بھی مرد مزدوروں کے مقابلے میں کم منظم تھیں۔

گو کہ فیکٹریوں میں کام کرنے والی عورتوں کی تعداد کا موازنہ مرد مزدوروں کے مقابلے میں کافی زبردست نظر آتا ہے۔ 1901ء-13 تک عورت مزدور کی تعداد 59 فیصد تک بڑھ گئی جبکہ مرد مزدور کی تعداد میں 29 فیصد اضافہ ہوا۔ یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سرمایہ دار ہمیشہ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لیے عورت کو کم اجرت کا مزدور جان کر اس کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے۔ مرد کی اجرت زیادہ ہونے کی وجہ سے ملازمت میں کمی رہتی ہے۔ جب عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتیاں بھی بڑھ گئیں۔ ہراساں کرنے کے واقعات میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ 1914 میں بالشویک کے اخبار میں جو کہ مزدور عورتوں کے مسائل پر جاری ہوا ان سب واقعات کی رپورٹنگ ملتی ہے۔

1905ء میں زار روس کے خلاف ایک بہت بڑی تحریک مزدوروں کی شرع ہوئی جو پیٹرز برگ سے شروع ہو کر سارے ملک میں پھیل گئی سوویت یونین میں سب سے بڑی مزدوروں کی تحریک تھی جو بڑی منظم اور مضبوط تھی۔ کوشش یہی تھی کہ اس تحریک سے انقلاب کی راہ نکل آئے اور اس تحریک میں عورتوں کی تعداد بھی زیادہ تھی ان مظاہرں اور ہڑتالوں کی وجہ سے مزدوروں کی ورکرز سویت کا قیام عمل میں آیا۔ 151 مرد مزدوروں اور 25 ٹیکسٹائل عورت مزدوروں نے اس میں شرکت کی۔ اس میں کاٹن ویونگ فیکٹری کی مزدور عورتیں بھی شامل تھیں۔ اس ورکرز سویت میں گروپ کے باضابطہ انتخابات عمل میں آئے جس میں 15 ورکنگ نمائندے منتخب ہوئے جس میں آٹھ عورتیں شامل تھیں اس طرح بالشویک پارٹی میں عورتوں کی تعداد 62 فیصد تک بڑھ گئی تعلیمی سرکل میں بھی اضافہ ہونے لگا۔

اس دوران بالشویک پارٹی اور ایک فیمنسٹ گروپ کے درمیان تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ مورخ Richard Stites کہتا ہے کہ فیمنزم کے پاس کوئی خاص جامع نظریات نہیں کہ کس طرح ورکرز عورتوں کے مسائل حل کریں اور حالات سے کس طرح چھٹکارا دلائیں۔ وہ صرف عورتوں کے ساتھ ہمدردی کر سکتے ہیں اس کے مقابلے میں مارکسزم کے پاس نظریاتی طور پر مکمل لائحہ عمل موجود ہے وہی مسائل کا حل نکال سکتا ہے اور بالشویک پارٹی اپنے ٹھوس نظریات اور سیاسی عمل سے عورتوں کو ان کے مسائل سے نجات دلا سکتی ہے اور یہ بھی واضح کیا گیا کہ فیمنسٹ گروپ میں اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والی عورتیں شامل ہیں جو مزدور

عورتوں کے مسائل کی گہرائی تک نہیں جاسکتیں وہ صرف ہمدردی کرسکتی ہیں لیکن ہمارا یعنی بالشویک پارٹی کا ان عورتوں کے ساتھ ویسا ہی تعلق رہے گا جس طرح دوسری عورتوں کی انجمنوں کے ساتھ ہے۔

دوسری طرف انٹرنیشنل کمیونسٹ موومنٹ نے بھی عورتوں کے مسائل پر گہری نظر رکھی اور توجہ بھی دی۔

اسی نکتہ پر Rosa Luxemburg نے سوشل ڈیموکریسی کے پلیٹ فارم سے عورتوں کے حق رائے دہی کے مسائل کو اٹھایا یہ ایک اہم مسئلہ تھا کیونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عورتیں کمزور ہوتی ہیں پرانے خیالات کو اہمیت دیتی ہیں مذہب سے لگاؤ ہوتا ہے اور یہ اپنا ووٹ دائیں بازو ہی کو ڈالیں گی Clara Zetkin جو جرمن سوشلسٹ لیڈر تھیں نے اس بات کی حمایت کی کہ عورتوں کو حق رائے دہی سے محروم نہ کیا جائے اور کہا کہ عورتوں کو ان کے مسائل سے چھٹکارا دلایا جائے۔ جس کی ولاڈیمیر لینن نے بھی حمایت کی اور کہا کہ مرد و اور عورت کے درمیان ہر سطح پر مساوات قائم ہونی چاہیے دوسری انٹرنیشنل کانگریس کو کامیاب بنائیں تاکہ ان مسائل کو اٹھایا جائے۔

1903 کو دوسری کانگریس منعقد ہوئی جس میں لینن نے عورتوں کے حق کے لیے مندرجہ ذیل مطالبات رکھے

- ☆...... **عورتوں کے حقوق کے لیے اور ان کے مسائل سے چھٹکارا دلانے کے لیے بڑے پیمانے پر تحریکیں چلائی جائیں۔**
- ☆...... **فیکٹری کے ماحول کو محفوظ بنایا جائے**
- ☆...... **اجرت مرد مزدور کے برابر کی جائیں۔**
- ☆...... **زچگی کی چھٹیاں مقرر کی جائیں**
- ☆...... **ہفتہ میں ایک دن کی چھٹی ہونی چاہیے**

فیکٹریز میں ایک انسٹرکٹر مقرر کریں جس کو کام کے مطابق تنخواہ دی جائے جو فیکٹری کے اندر ماحول کو بہتر رکھنے کی کوشش کرے اور جنسی زیادتی و ہراساں ہونے کے واقعات پر نظر رکھے کام کے اوقات کی پابندی بھی کروائے۔

عورتوں کے مسائل پر لینن کی بیوی Nadezhda Krupskaya نے ایک مکمل تفصیلی مضمون لکھا جس میں فیکٹری ورکرز اور کسان عورتوں کے حقوق کے بارے میں بتایا یہ بھی بتایا کہ فیکٹری ورکرز کے اوپر مالکان کا دباؤ ہوتا ہے کہ جنسی ورکرز کے طور پر بھی کام کرو حاملہ عورتوں کو کوئی سہولت مہیا نہیں کی جاتی ورکرز سے کم اجرت میں زیادہ اوقات میں زیادہ کام لیا جاتا ہے۔

Krupskaya ایک انقلابی مارکسٹ تھیں انقلابی جدوجہد میں پیش پیش تھیں ہر مظاہرے اور ہڑتال میں بھی شامل ہوتی تھیں وہ سینٹرل کمیٹی آف رشین ڈیموکریٹک پارٹی کی سیکریٹری بھی رہیں پارٹی کی طرف سے جو جرنل نکلتا تھا اس کو بھی ایڈٹ کرتی تھیں انہوں نے عورتوں کے حقوق کی لڑائی اور جدوجہد پر بہت سارے مضامین لکھے۔ ان کے ساتھ دیگر سوشلسٹ عورتیں بھی شامل ہوگئیں اس کی وجہ سے فیکٹریز ورکرز اور کسان عورتیں منظم ہونے لگیں اس ہی دوران ان کی ملاقات ولادیمیر لینن سے ہوگئی جن کی وہ بعد میں زندگی کی ساتھی بن گئیں۔

عورتوں میں مینشویک پارٹی کی طرف رجحان کم ہوتا جا رہا تھا کیونکہ عورتوں نے محسوس کیا کہ ان کے مسائل کی جدوجہد میں بالشویک پارٹی ہی ساتھ دے سکتی ہے اس کے پاس منظم اور جامع پروگرام ہے۔

1907ء میں پارٹی کی لیڈرشپ میں عورتوں کی تعداد میں بیس فیصد اضافہ ہوا جس کی وجہ سے شہر بھر میں عورتوں کے مراکز قائم ہوگئے جہاں انہیں جنگ کے خلاف تیار کرنے پر زور دیا جاتا تھا بلکہ بالشویک پارٹی نے عورتوں کی انقلابی جدوجہد کا ایک گروپ تشکیل دیا جو زیر زمین کام کرتا تھا جس کی نگراں Rosalina Zemlyachka اور Elena Stasova تھیں جو ماسکو اور پیٹرس برگ میں کام کرتی تھیں۔ عورتوں میں انقلابی کام کی معلومات کو بڑھانے کے لیے انقلابی میگزین Inessa Armand نے نکالا جو خود ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس میگزین میں غریب اور ملازمت پیشہ خواتین کے بارے میں مضامین ہوتے تھے انہوں نے اس میگزین کے ذریعہ پارٹی کے لیے بھرپور کام کیا اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے پارٹی کو عوام اور عورتوں میں مقبول کیا جس کی وجہ سے لینن کی دوست بھی ہوگئیں۔ اس میگزین کا نام Raboiniska تھا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ اس میگزین کی وجہ سے عورتوں نے اہم کردار ادا کیا سوشلزم کی جدوجہد اور تحریک بنیں۔ انقلاب کو رونما کرنے میں عورتوں کی اسی تحریک نے ٹریڈ یونین کے قیام میں کلیدی کردار ادا کیا۔ یہ میگزین 1927 تک جاری رہا پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دیگر مزید 18 میگزین چھپنے لگے جس کی وجہ سے پارٹی میں عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔

روسی انقلاب 1917 کے فوراً بعد جو لوگوں کا نعرہ تھا امن، روٹی اور زمین' تھا انہوں نے بالشویک پارٹی سے مطالبہ کیا کہ نکولس اور روس کی حکومت کے خاتمہ کا اعلان ہو۔ بورژوازی صوبائی حکومتوں کا خاتمہ کیا جائے اس سلسلے میں مظاہرے جلوس پورے ملک میں ہورہے تھے جس میں عورت ورکرز بھی پر جوش

طریقے سے حصہ لے رہی تھیں ۔عوامی اجلاس میں بھی شرکت کر رہی تھیں ۔ کتابچے بھی تقسیم کر رہی تھیں ہتھیاروں کی نقل وحمل میں بھی شامل تھیں زخمیوں کی دیکھ بھال بھی کر رہی تھیں ۔ میگزین بھی شائع کیے گئے تاکہ عوام تک انقلاب کی خبریں صحیح پہنچ سکیں اور وہ انقلابی سرگرمیوں سے آگاہ رہیں۔

دیکھا یہ گیا تھا کہ زار کے دور میں عنان حکومت چلانے میں چرچ کا بہت زیادہ عمل دخل تھا اس لیے انقلاب کے فوراً بعد مذہب کو ریاستی امور سے الگ کر دیا گیا تھا۔

بالشویک پارٹی نے اقتدار لینے کے چار دن بعد مرد عورت کے درمیان مساوات کو یقینی بنایا۔عورتوں کو سیاست میں حصہ لینے کے امکانات کو اہمیت دی گئی۔

کام کے اوقات 8 گھنٹے مقرر کیے گئے۔عورتوں پر عائد تمام پابندیاں ختم کر دی گئیں۔زمین کی ملکیت میں مردوں کے برابر کا حق منظور کیا گیا۔عورتوں کی معاشرتی وسماجی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں کی گئیں شادی عورت مرد کی باہمی رضا مندی سے ہوگی ۔طلاق بھی باہمی رضامندی سے طے کرنے کا قانون بنایا۔ اسقاط حمل کی بھی اجازت دی گئی۔زچگی کے دوران تنخواہ کے ساتھ چھٹی منظور کی گئی ۔ہسپتالوں میں زچگی کے وارڈ قائم کیے گئے۔تمام بچوں کو یکساں علاج کی سہولت مہیا کی گئی۔تعلیم کو عام کیا گیا جس کے لیے پورے ملک میں ہر ضلع شہر میں اسکول کھولے گئے ۔ساتھ ساتھ کھیل کے میدان بھی مختص کیے گئے عورت مزدور کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بچوں کی نگہداشت کے مراکز قائم کیے گئے عورتوں کی تربیت کے مراکز بھی بنائے گئے ۔عورتوں پر گھر کی ذمے داری کم کرنے کے لیے عوامی کچن قائم شروع کیے گئے۔

ان عورتوں کو جو سوشلزم سے ناواقف تھیں لیکن سیاست میں آنا چاہتی تھیں اپنے پروگرام میں شامل کیا تاکہ زیادہ سے زیادہ عورتیں سوشلزم میں شامل ہوجائیں اس طرح پہلی سوویٹ یونین کی سفیر Kollontia کو بنایا گیا۔

انقلاب کے بعد ملک میں عوام ومزدور کی ترقی کے لیے بہت سارے اقدامات کیے گئے تمام پرانے قوانین کو ختم کر دیا گیا تمام عمارتوں پر انقلابیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔بہت ساری عمارتوں میں عورتوں کے لیے فلاحی مراکز بنا دیے گئے تھے۔حکومتی کام کے سیکریٹریٹ بھی بنائے گئے جس میں عورتوں کا شعبہ بنا دیا گیا۔

تبدیلی کا عمل اس وقت ہی ممکن ہوتا ہے جب معاشرے میں اور ملک میں ایسی عوامی پالیسیاں نافذ کی جائیں جہاں جبر نہ ہو، استحصالی نظام نہ ہو، ضرورت کے مطابق اجرت مقرر ہو، کام کے اوقات مقرر ہوں صحت وتعلیم کا انتظام حکومت کی ذمے داری ہو۔اس طرح روس دنیا کے سب سے پہلے اشتراکی ملک کی شکل میں وجود میں آیا جو عوام کی جدوجہد سے دنیا میں مثال بن گیا۔

ولادیمیر لینن نے 1921 میں کہا تھا:

"No party or revolution in the world has ever dreamed of striking so deep at the roots of the oppression and inequality of women as the Soviet Bolshevik revolution is doing. Over here, in Soviet Russia, no trace is left of any inequality between men and women under the law. The Soviat power has eliminated all there was of the especially disgusting, base and hypocritical inequality in the law on marriage and family, and inequality in the respect of children."

جمہوریت اور فوج

تحریر: ڈاکٹر توصیف احمد

میاں نواز شریف اس ملک کے شاید پہلے سیاست دان ہیں جنہوں نے سیاست کی تھیوری کا کبھی سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا مگر اقتدار میں آنے کے بعد حقائق نے ان کی سوچ کو تبدیل کر دیا اور یہی ان کا جرم بن گیا۔میاں نواز شریف نے بین الاقوامی صورت حال کا ادراک کرتے ہوئے بھارت اور افغانستان سے اچھے تعلقات کو اپنی بنیادی پالیسی کا حصہ بنایا یوں گزشتہ دور حکومت میں میاں نواز شریف بھارت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کو دوستی کی بس میں بٹھا کر لاہور لے آئے جس کے بعد فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف کو کارگل پر چڑھائی کرنی پڑی تاکہ پاکستان اور بھارت میں دوستی کا عمل سبوتاژ ہوجائے۔اس دوران ہی جنرل پرویز مشرف نے میاں نواز شریف کا تختہ الٹ دیا۔میاں نواز شریف کو کئی ماہ تک اٹک قلعہ کی ایک اندھیری کوٹھری میں تنہا گزارنے پڑے۔انہیں ہتھکڑیاں باندھ کر سی ون طیارے کی سیٹ سے باندھ دیا گیا یوں میاں نواز شریف خود فوجی اقتدار کے غیر انسانی سلوک کا تجربہ ہوا ۔میاں نواز شریف نے ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ وہ بھارت سے دوستی اور تجارت کے حامی

ہیں مگر عسکری اسٹیبلشمنٹ نے فروری ۲۰۱۳ء سے لائن آف کنٹرول کو گرم کر دیا تھا جب مسلم لیگ ن کی حکومت قائم ہوئی تو محسوس ہوتا تھا کہ کنٹرول لائن پر جھڑپیں بڑی جنگ میں تبدیل ہو جائیں گی۔ میاں نواز شریف نے وزیر اعظم مودی سے ذاتی تعلقات قائم کیے۔ انہوں نے مودی کو اپنی نواسی کی شادی کی تقریب میں مدعو کیا۔ میاں نواز شریف حکومت نے دونوں ممالک کے درمیان تجارت کو بڑھانے کے لیے بھارت کو پسندیدہ ترین ملک (MFN) قرار دینے کے معاملہ کو عملی شکل دینے کی کوشش کی۔ بھارت نوے کی دہائی میں پاکستان کو پسندیدہ ملک کا درجہ دے چکا ہے۔ مسلم لیگ کی اس حکومت نے افغانستان سے تعلقات کو بھی معمول پر لانے پر غور کرنا شروع کیا صدر ممنون حسین کو افغانستان کے دورے پر بھیجا گیا صدر ممنون کی کابل میں موجودگی کے دوران دو طرفہ تجارت کے کئی درجن معاہدے ہوئے۔ میاں صاحب کی یہ پالیسی عسکری اسٹیبلشمنٹ کے مفاد کے منافی تھی یوں پہلی دفعہ مسلم لیگی وزیر اعظم کے خلاف پروپگنڈا شروع ہوا۔ جماعت اسلامی اور حافظ سعید نے میاں نواز شریف کے بارے میں منفی پروپگنڈا نشر کیا۔ اس دوران میاں صاحب نے سابق صدر پرویز مشرف کو جیل بھجوانے کی ٹھانی میاں نواز شریف نے عوام کے حالات کار میں تبدیلی کے لیے بنیادی پالیسیاں نہیں بنائیں وہ اور شہباز شریف صرف اورنج لائن ٹرین اور میٹرو چلا کر عوام کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں پھر ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں بیوروکریسی نے بعض سوراخ چھوڑ دیے تھے عمران کے دھرنوں کے ذریعہ میاں نواز شریف اور عوام کے درمیان خلیج کو استعمال کرنے کی کوشش کی گئی عمران خان نے چھ ماہ تک اسلام آباد میں دھرنا دیا جس کا انہیں کچھ فائدہ نہیں ہوا مگر سول حکومت ملٹری اسٹیبلشمنٹ کے دباؤ میں آ گئی۔ سابق چیف آف اسٹاف جنرل راحیل شریف نے بھارت اور ایران کے خلاف پالیسی اختیار کی۔ یوں ایک بھارتی جاسوس کے معاملے پر ایران کے صدر کے ساتھ اسلام آباد میں ہتک آمیز سلوک کیا گیا پھر بدقسمتی سے پانامہ اسکینڈل سامنے آ گیا سابق وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان کی پالیسی کی بنا پر پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کا کمزور اتحاد بھی ختم ہو گیا۔ سپریم کورٹ نے میاں نواز شریف کو نااہل قرار دے دیا۔ اس فیصلے کی شفافیت کے بارے میں سوال اٹھنے لگے مگر میاں نواز شریف اور ان کے خاندان والوں نے سیاست کرنے اور اسٹیبلشمنٹ کو چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا لاہور کے قومی اسمبلی کے حلقہ ۱۲۰ میں کلثوم نواز کی کامیابی سے نواز شریف کی سیاست کو تقویت ملی۔ پہلی دفعہ پنجاب میں خفیہ عسکری ایجنسی نے مسلم لیگ ن کو نشانہ بنایا قومی اور صوبائی اسمبلی کے اراکین کو نامعلوم افراد کے فون آنے لگے۔ حلقہ ۱۲۰ میں ضمنی انتخاب کے دن مسلم لیگ کے اہم ترین کارکنوں کو نامعلوم افراد ڈبل کیبن گاڑی میں ساتھ لے گئے۔ پھر ختم نبوت کے طے شدہ مسئلے کو جذباتی رنگ دے دیا گیا۔ کئی اراکین کے استعفوں کی خبریں شائع ہوئیں۔ پیر سیالوی نے فیصل آباد میں بڑے جلسے میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے استعفوں کی پیشین گوئی کی مگر اس دوران پیپلز پارٹی اور وفاقی حکومت میں مردم شماری کے نتائج کے آڈٹ پر اختلافات اتنے بڑھے کہ انتخابی حلقہ بندیوں سے متعلق آئینی ترمیم کا معاملہ رک گیا۔ پھر قومی اسمبلی کے اسپیکر بھی مایوس ہو گئے انہیں اندیشہ ہوا کہ اسمبلیاں اپنی آئینی مدت پوری نہیں کر سکیں گی۔ اس دوران امریکہ کے صدر ٹرمپ نے اس خطے کے بارے میں اپنی پالیسی میں پاکستان کو ٹارگٹ کرنا شروع کیا۔ امریکہ نے حقانی نیٹ ورک کے عدم خاتمے، حافظ سعید کی جماعت کے سیاست میں حصہ لینے اور طالبان کے اڈوں کا خاتمہ نہ کرنے پر پاکستان کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا تاریخ میں پہلی دفعہ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات منفی حدود پار کر گئے۔ اس دوران پیپلز پارٹی کو بھی یہ احساس ہوا کہ انتخابات کے انعقاد نہ ہونے سے اس کا نقصان بھی کم نہیں ہوگا۔ اسی طرح پختون خوا کے وزیر اعلیٰ پرویز خٹک نے اپنے قائد عمران خان کے قبل از وقت انتخابات کے نظریے کی حمایت نہیں کی۔ پرویز خٹک اپنی ترقیاتی اسکیمیں مکمل کرنا چاہتے ہیں تاکہ آئندہ عام انتخابات میں وہ عوام کے سامنے سرخرو ہو سکیں یہی وجہ تھی کہ تحریک انصاف کے سینیٹروں نے بھی سینیٹ میں آئینی ترمیم کے خلاف ووٹ نہیں دیا۔ میاں نواز شریف نے اپنے خاندانی اختلافات کے خاتمے کے لیے بھائی شہباز شریف کو وزیر اعظم کا امیدوار بنانے کا فیصلہ کیا کچھ حلقوں کا خیال ہے کہ میاں نواز شریف نے شہباز شریف کو وزیر اعظم نامزد کر کے اسٹیبلشمنٹ سے مفاہمت کی کوشش کی ہے۔ اس اعلان سے میاں نواز شریف نے پنجاب کے ان مسلم لیگی رہنماؤں کو بھی جوڑنے کی کوشش کی جو شہباز شریف کی پالیسیوں سے اتفاق کرتے ہیں اور اسٹیبلشمنٹ سے کسی بھی قسم کی ٹکر لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ واضح ہو گیا ہے کہ سینیٹ کے انتخابات مقررہ وقت پر مارچ میں ہوں گے اور پھر عام انتخابات جون یا جولائی میں منعقد ہوں گے متوقع انتخابات میں میاں نواز شریف اور ان کی بیٹی مریم نواز شہباز شریف کے ساتھ کھڑے ہوں گے شہباز شریف اسٹیبلشمنٹ سے مفاہمت کے حامی ہیں اگر انہوں نے اپنے بھائی کی سیاست سے انحراف کیا تو ان کے اقتدار کی مدت کم ہوگی۔ شہباز شریف کو عام انتخابات میں عمران خان کو چیلنج کرنا پڑے گا۔ وہ متوسط طبقے کی ترقی کے ماڈل کی بنیاد پر عمران خان کو شکست دے سکیں گے اس سوال کا جواب کئی مسائل کا حل ہے۔ ☆☆

بھٹہ مالکان نے ریاست کے اندر ریاستیں قائم کر رکھی ہیں

تحریر: اصغر شاہین

فیصل آباد میں تقریباً 500 بھٹہ جات پر کام کرنے والے 50/45 ہزار بھٹہ مزدور (پتھیرے) خشت میکر نسل در نسل خانہ بدوشی اور بھٹہ مالکان کی غنڈہ گردی، ظلم و جبر، جبری مشقت، غلامی تشدد، بھوک ننگ اور لاقانونیت کا شکار ہیں اور جانوروں سے بھی بدترین زندگی گزار رہے ہیں اور زندگی کی تمام بنیادی و قانونی سہولتوں سے محروم انتہائی ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور و بے بس ہیں اور کوئی انکا پرسان حال نہیں ہے۔ بھٹہ مالکان نے ریاست کے اندر ریاستیں قائم کر رکھی ہیں اور مکمل طور پر اپنی من مانیاں کر رہے ہیں، بلا خوف و خطر آئین پاکستان اور قانون کی دھجیاں اڑا رہے ہیں اور بھٹہ جات پر غنڈہ گردی، ظلم و جبر، لاقانونیت اور اندھیر نگری کا راج قائم کر رکھا ہے۔ تمام بھٹہ خشت پر سرکاری رٹ نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی، مگر کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں ہے۔ شائد ارباب اختیار اور تمام ذمہ داران بھی ہم بھٹہ مزدوروں کی طرح بھٹہ مالکان کے سامنے مجبور و بے بس ہیں۔ یا پھر..... ؟

آئین پاکستان کے آرٹیکل نمبر 11 کے تحت پاکستان کی حدود میں جبری مشقت، غلامی، بچہ مزدوری، اور انسانی خرید و فروخت پر مکمل طور پر پابندی عائد ہے اور بانڈڈ لیبر ابالیشن ایکٹ 1992 ہر قسم کی جبری مشقت اور پیشگی کے خاتمے کا قانون ہے، اس ایکٹ کے تحت پیشگی کی آڑ میں جبری مشقت کروانے، پیشگی دینا، اور پیشگی کی رقم واپس لینا جرم قرار دے دیا گیا ہے۔

لیکن بھٹہ مالکان آئین اور قانون کی مکمل طور پر خلاف ورزی کر رہے ہیں اور نام نہاد پیشگی کی آڑ میں بھٹہ خشت پر جبری مشقت، غلامی، بچہ مزدوری، اور انسانی خرید و فروخت سر عام ہو رہی ہے بھٹہ مالکان نام نہاد پیشگی کی وجہ سے بھٹہ مزدوروں کو قانون کے مطابق اجرت بھی نہیں دے رہے ہیں اور نام نہاد پیشگی کی آڑ میں بھٹہ مزدوروں کی اجرت میں سے ناجائز کٹوتی کے ذریعے بھاری رقم کاٹ رہے ہیں جیسا کہ موجودہ گزٹ نوٹیفکیشن کے مطابق بھٹہ مزدوروں کی اجرت 1110 روپے فی ہزار عام اینٹ مقرر کی گئی ہے، مگر بھٹہ مالکان جو اجرت ادا کر رہے ہیں کہیں 600/500 روپے ہے لیکن اس کے باوجود نام نہاد پیشگی ختم نہیں ہو رہی بلکہ اور زیادہ ہو رہی ہے۔

ماضی میں بھی جب بھی گزٹ نوٹیفیکیشن جاری ہوا ہے بھٹہ مالکان اسی تناسب سے کٹوتی کرتے رہے ہیں لیکن نام نہاد پیشگی ختم نہیں ہوئی، جس کی وجہ سے بھٹہ مزدور نسل در نسل غلامی اور نام نہاد پیشگی کی زنجیروں میں جکڑے چلے آرہے ہیں ان حالت میں ہم بھٹہ مزدوروں کو دو وقت کی روٹی ملنا بھی مشکل ہو رہی ہے، ہماری یہ حالت 70 سال سے جوں کی توں ہے، الحمدللہ پاکستان کو آزاد ہوئے 70 سال ہو گئے ہیں مگر افسوس کہ ہم اپنے ہی ملک میں غلامی، خانہ بدوشی، جبری مشقت، بھوک و ننگ، ظلم و جبر، اور لاقانونیت کا شکار ہیں اور زندگی کی تمام بنیادی سہولتوں تعلیم، صحت، خوراک، رہائش، عزت وقار اور تحفظ سے محروم ہیں اور نہ جانے کب تک رہیں گے۔

ہم اپنے حکمرانوں اور ریاستی انتظامیہ سے پوچھتے ہیں کہ ہمارا قصور کیا ہے اور ہمیں کس بات کی سزا دی جا رہی ہے، کیا ہمارا جرم یہ ہے کہ ہمارے ہی ہاتھوں سے بنائی اینٹوں سے پیارے پاکستان میں گھر، کوٹھیاں، محلات، اسکول، کالج، یونیورسٹی، ہسپتال، مل، کارخانے، پل، سڑکیں، تھانے، عدالتیں، اسمبلی ہالز، اور تمام سرکاری و غیر سرکاری اداروں کی عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں اور ان عمارتوں سے جڑے تمام پاکستانیوں کا رزق اور عزت و وقار جڑا ہوا ہے اور ہماری شب و روز کی محنت سے ہی ملکی معیشت کا پہیہ چل رہا ہے۔ ہمارا اپنے تمام پاکستانی بھائیوں سے ایک سوال ہے کہ کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ یہ اینٹیں بنانے والے کون ہیں اور انکی زندگی کیسے گزر رہی ہے (نہیں سوچا نہ، کیوں)؟

بھٹہ مالکان کی طرف سے بھٹہ خشت پر جو بھٹہ مزدوروں کو رہائش کے لئے مکان دئے جاتے ہیں ان سے کہیں اچھے مکان تو لوگ اپنے پالتو جانوروں کے لئے بناتے ہیں ان مکانات میں لیٹرین نہیں ہوتی، نہ ہی پینے کا پانی، نہ دروازے اور نہ ہی صحن۔ ان حالات میں چادر اور چار دیواری کا تقدس بری طرح پامال ہوتا

ہے اس وجہ سے بھٹہ مزدوروں کے احساسات بری طرح مجروح ہونے کے ساتھ ساتھ اکثر جنسی ہراسمنٹ کے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں جو کہ بھٹہ مزدوروں کے لئے انتہائی پریشانی اور جھگڑے کا باعث بھی بنتے ہیں۔

اگر بھٹہ مزدور اپنے اوپر ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائیں تو ان کو جھوٹے فوجداری مقدمات میں پھنسا دیا جاتا ہے اور انکی آواز کو جبراً دبا دیا جاتا ہے یوں بھٹہ مزدور چپ چاپ جبر سہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اندریں حالات ہماری آپ سے مودبانہ اپیل ہے کہ آپ بھٹہ مزدوروں کے ساتھ ہونے والی ان تمام زیادتیوں اور ناانصافیوں کا نوٹس لیں اور بھٹہ مالکان کے خلاف قانونی کاروائی کرتے ہوئے بھٹہ مزدوروں کو ہمیشہ کے لئے نام نہاد پیشگی کی زنجیروں، جبری مشقت، غلامی، ظلم و جبر، لاقانونیت، خانہ بدوشی، بھوک ونگ، اور بھٹہ مالکان کی غنڈہ گردی سے آزاد کروا کر انکو مکمل طور پر بحال کروائیں تاکہ ہم بھٹہ مزدور بھی باقی تمام پاکستانیوں کی طرح آزاد اور خوشحال زندگی گزار سکیں۔ تمام بھٹہ خشت پر سرکاری رٹ قائم کرائیں، بھٹہ مزدوروں کو قانون کے مطابق پوری اجرت دلوائیں، اجرت میں سے ناجائز کٹوتی کو فوری طور پر بند کروائیں، تمام بھٹہ مزدوروں کے سوشل سکیورٹی کارڈ بنوائیں، بھٹہ مزدوروں کے لئے رہائشی کالونیاں بنائی جائیں، بھٹہ مالکان کو لیبر قوانین کا پابند بنایا جائے، بھٹہ مزدوروں کی مکمل آزادی اور بحالی کے لئے رقم کا بندوبست عشر و زکوۃ، بیت المال اور ورکر ویلفئر فنڈ سے کیا جائے، اور بھٹہ مزدوروں کو نام نہاد پیشگی اور جبری مشقت سے آزاد کروایا جائے، عین نوازش ہوگی۔

☆☆☆

عوامی ورکرز پارٹی کی وفاقی کمیٹی کے دوروزہ اجلاس کے فیصلے

رپورٹ: عابد شکیل فاروقی

عوامی ورکرز پارٹی کی وفاقی کمیٹی کا دوروزہ اجلاس مورخہ 8 اور 9 دسمبر کو نوشہرہ (خیبر پختونخوا) میں منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل فیصلے کیے گئے

1۔ موجودہ ملکی اور بین الاقوامی سیاسی صورت حال پر تفصیلاً بحث کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ملک میں بنیادی سماجی تبدیلی کے لیے صرف بائیں بازو کی ترقی پسند پارٹیاں ہی متبادل پیش کر سکتی ہیں لہذا ترقی پسند پارٹیوں کا اتحاد قائم کیا جائے اس سلسلے میں پارٹی کے جنرل سیکریٹری تمام ترقی پسند پارٹیوں کو خط تحریر کریں گے اور جلد ایک مشترکہ اجلاس بلائیں گے۔

2۔ پورے ملک میں پارٹی یونٹوں کو فعال کرنے کے لیے جو عہدے خالی ہیں یا کوئی عہدیدار بالکل غیر فعال ہے اس کی جگہ متعلقہ کمیٹی کے مشورے سے فعال رکن نامزد کیا جائے

3۔ رکنیت سازی کی مہم پارٹی دستور اور رکنیت فارم کے مطابق تیز کی جائے۔

4۔ مرکزی تنظیمی سیکریٹری تمام یونٹوں سے رکنیت سازی کی فہرستیں جمع کر کے ریکارڈ مرتب کریں تمام یونٹوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ان کے ساتھ تعاون کریں۔

5۔ لیبر کمیٹی کی رپورٹ کامریڈ صفدر سندھو گزشتہ اجلاس میں بحث اور دی گئی تجاویز خاص کر بیرون ملک پاکستانی کارکنوں کے مسائل کو شامل کرتے ہوئے ایک ماہ میں مرتب کر کے جنرل سیکریٹری کو ارسال کریں گے

6۔ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن پروگریسیو ٹریڈ یونین فیڈریشن اور محنت کش ٹریڈ یونین فیڈریشن تینوں کا مشترکہ اجلاس جنوری ۲۰۱۸ء میں منعقد کر کے ایک فیڈریشن میں ضم ہونے کے امکانات کی رپورٹ جنرل سیکریٹری کو ادا کی جائے گی۔

7۔ کسان کمیٹی کی زراعت' زرعی معیشت' اور کسانوں کھیت مزدوروں کے بارے میں حتمی رپورٹ مرتب کرنے کے لیے حسن عسکری فاروق طارق اور عصمت شاہجہاں پر مشتمل کمیٹی قائم کی گئی جو تین ماہ کے اندر جنرل سیکریٹری کو پیش کریں گے پارٹی کا کوئی بھی ساتھی اس کمیٹی کو تحریری تجاویز بھیج سکتے ہیں۔

8۔ طلبا یوتھ کمیٹی کا تیار کردہ پروگریسیو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا ڈرافٹ منشور و دستور منظور کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ اس کو طلبا میں وسیع پیمانے پر تقسیم کیا جائے گا اور کمیٹی اپنا اجلاس منعقد کر کے فروری ۲۰۱۸ء میں کانفرنس کے انعقاد کی جگہ اور تاریخ کا اعلان کرے گی۔

9۔ خواتین کمیٹی خواتین تنظیم کے لیے ڈرافٹ منشور و دستور مرتب کر کے تقسیم کرے گی اور اس کے بعد کنونشن کا انعقاد کیا جائے گا کوئی مسئلہ ہو تو جنرل

سیکریٹری سے مشاورت کی جائے گی۔

10۔ڈیموکریٹک لائرز ایسوسی ایشن (ڈی ایل اے) کی تنظیم نو کی جائے گی، پارٹی کی طرف سے کامریڈ کفایت اللہ کو KP میں زاہد پرویز کو، پنجاب میں فرحت عباس کو سرائیکی وسیب میں جمیل شاہد کو سندھ میں نثار شاہ کو کشمیر میں، احسان علی کو GB میں منظّم کرنے کی ذمے داری دی گئی۔ اختر حسین مرکزی آرگنائزر کی حیثیت سے سب سے رابطہ رکھیں گے۔

11۔(i) الیکشن کمیٹی کی رپورٹ پر طے کیا گیا کہ ملک میں عام انتخابات کے لیے قومی کمیٹیاں پارلیمانی بورڈ نامزد کریں گی۔

(ii) الیکشن مینی فیسٹو اسلام آباد کے ساتھی تحریر کر کے جنرل سیکریٹری کو ارسال کریں گے پارٹی منشور دوبارہ شائع کیا جائے گا۔

12۔(i) میڈیا کمیٹی کی رپورٹ پر سوشل میڈیا کے حوالے سے طے کیا گیا کہ ضلعی یا یونٹ کمیٹیاں اپنے کاموں کی رپورٹ صوبائی/قومی پارٹی کے صفحے پر ڈالیں گے جہاں سے مرکزی/ وفاقی صفحے پر شائع کیا جائے گا تمام یونٹوں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ پرنٹ میڈیا/ اخبارات میں اشاعت کی شعوری کوشش کریں۔

(ii) پارٹی سرکلر جنوری ۲۰۱۸ء سے متواتر شائع کیا جائے گا اور اس کمیٹی میں کامریڈ شازیہ خان کو بھی شامل کیا گیا۔

(iii) ملکی انتخابات کے حوالے سے کتابچہ مکمل ہوگیا ہے اس کی اشاعت کے لیے کامریڈ فاروق طارق فوری انتظام کریں گے۔

13۔فیصلہ کیا گیا کہ ملک میں جہاں بھی پارٹی یونٹ منظّم ہیں اور پارٹی دو تین ہزار ووٹ لے سکتی ہے وہاں ملکی انتخابات میں امیدوار کھڑے کیے جائیں۔

عوامی ورکرز پارٹی کی طرف سے بائیں بازو کی ترقی پسند پارٹیوں کو خط

اجلاس

صبح 11-00 بجے 29 دسمبر 2017 بروز جمعہ

(B-78 مزنگ روڈ (آف میسن روڈ، بالمقابل برٹش کونسل لاہور)

محترم/محترمہ..................

پاکستان میں سیاسی و معاشی بحران ایک بار پھر سے گھمبیر ہوتا جارہا ہے۔ ایک طرف ہماری معیشت و سیاست پچھلے 70 سالوں سے فوجی اسٹیبلشمنٹ کے پاس گروی ہے تو دوسری طرف ملک میں ٹوٹی پھوٹی جمہوریت اور پارلیمانی نظام کو ایک بار پھر اسٹیبلشمنٹ اور مذہبی قدامت پرستوں کی طرف سے گرانے کا خطرہ ہے۔ اوپر سے پاکستان کے کثیر القومی اور کثیر الطبقاتی سماج میں بڑے بڑے زمینداروں، قبائلی سرداروں، خوانین، سرمایہ داروں اور سول و فوجی نوکر شاہی نے نہ تو یہاں بسنے والی قوموں کی برابری اور ان کے معاشی وسائل پر ان کی قدرت کو کبھی تسلیم کیا ہے اور نہ ہی بنیادی زرعی اور صنعتی تبدیلی کے ذریعے کروڑوں کسانوں، کھیت مزدور اور صنعتی مزدوروں کی خوشحالی اور زندگی بدلنا ان کی سیاست کے ایجنڈے پر ہے اور نہ ہی ہو گا ملکی آبادی کا ۴۸ فیصد خواتین ہیں جو کہ تہرے استحصال کا شکار ہیں اور برابر کے سیاسی سماجی و معاشی حقوق کا مطالبہ کرتی رہی ہیں۔ حکمران طبقات کی پارٹیوں کی سیاست ایک دوسرے پر محض کرپشن و بدعنوانی کے الزامات کے گرد گھومتی ہے جبکہ ہمارے نزدیک کرپشن و بدعنوانی سرمایہ دارانہ نظام کا لازمی جز ہے۔

پاکستان کے حکمران طبقات نے ملک کے قیام کے فوراً بعد ہی ملک کو امریکہ کی سرخیلی میں سامراجی مفادات کے ساتھ نتھی کر دیا اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سرمایہ دارانہ سماجی لوٹ کھسوٹ کو جاری رکھنے کے لیے مذہب کو ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا جس کی وجہ سے آج ہم مذہبی انتہا پسندی، عدم برداشت، فرقہ واریت اور دہشت گردی کا شکار ہیں۔

سوویت یونین اور سوشلسٹ بلاک کے انہدام کے بعد سامراجی گلوبلائزیشن اور اس سے جڑی جیو پالیٹکس اور مالیاتی سرمائے کی آئی ایم ایف، ورلڈ بنک اور آزاد مارکیٹ کی پالیسیوں کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کے استحصال اور معاشی لوٹ کھسوٹ کے باوجود آج جہاں سرمایہ داری نظام شدید

بحران کا شکار ہے وہیں اس کی سیاسی وفوجی بربریت عروج پر ہے جس کی واضح مثالیں عراق، لیبیا، شام، یمن اور افغانستان کی تباہی ہے اس لیے آج دنیا بھر میں حالات متبادل معاشی و سیاسی نظام کا تقاضا کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک ان ملکی اور بین الاقوامی معاشی وسیاسی حالات میں ملک کی تمام بائیں بازو اور ترقی پسند قوم پرست قوتیں ہی ملک کے عوام کے سامنے متبادل پیش کرسکتی ہیں اور متحدہ جدوجہد کے ذریعے ہی سماج میں بنیادی تبدیلی لاسکتی ہیں مگر آج نہ صرف ہم بکھرے ہوئے ہیں بلکہ ریاستی جبر اور جبری گمشدگیوں کا بھی شکار ہیں۔اگر ہم اسی طرح بکھرے رہے تو استحصال، جبر اور تشدد کی کسی ایک مخصوص شکل کے خلاف ہم انفرادی جدوجہد سے بتدریج محدود حقوق تو حاصل کر پائیں گے لیکن ایک ایسے نظام کا قیام نہیں کر پائیں گے جس میں معاشرے کے تمام افراد کو کلی طور پر سماجی انصاف مل سکے ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں ترقی پسند حلقوں کی بقا بھی صرف مشترکہ جدوجہد میں ہے۔

اس ضمن میں ہم مشترکہ جدوجہد کے لیے ترقی پسند پارٹیوں اور گروپوں کا ایک ملک گیر مشترکہ فارم تشکیل دینے کے لیے ایک مشاورتی اجلاس تجویز کرتے ہیں۔ہمیں اپنی یکجہتی کا پلیٹ فارم اور حکمت عملی محض واقعات کے ردعمل میں نہیں بلکہ اپنی نظریاتی اساس کو سامنے رکھتے ہوئے تشکیل دینا ہوگی کیونکہ ہماری جدوجہد طویل اور صبر آزما ہے اور ہمیں مشترکہ طور پر اپنے مندرجہ ذیل بنیادی اہداف کے ساتھ ایک ساتھ چلنا چاہیے۔ہم درج ذیل نکات بحث کے لیے تجویز کرتے ہیں اور ان نکات کو ترقی پسند پارٹیوں اور گروپوں کے ساتھ بحث کے بعد باہمی اتفاق سے آخری شکل دی جائے گی:

1۔ پارلیمنٹ کی حقیقی بالادستی کے لیے جدوجہد کرنا اور نیشنل سیکورٹی اسٹیٹ کے تصور کے برخلاف ایک نئے عمرانی معاہدے کی تشکیل اور عوامی جمہوریت کا قیام

2۔ عام انتخابات اور پارلیمانی نظام میں مزدوروں، کسانوں، ہاریوں، خواتین کی نمائندگی یقینی بناتے ہوئے متناسب نمائندگی کا نظام رائج کرنا۔

3۔ ملک میں انقلابی زرعی اصلاحات کے نفاذ کے ساتھ زمین کی حد ملکیت پچیس ایکڑ فی کاشتکار خاندان مقرر کرتے ہوئے باقی زمین کسانوں، ہاریوں اور کھیت مزدوروں میں مفت تقسیم کرنا، کارپوریٹ فارمنگ اور زرعی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اجارہ داری کا خاتمہ۔ پانی کی منصفانہ تقسیم اور ماحولیات کا تحفظ۔

4۔ سماجی انصاف میں کلیدی کردار ادا کرنے والے بنیادی اور ضروری صنعتی شعبوں کو قومی تحویل میں لینا اور ان میں کام کرنے والے محنت کشوں کا کنٹرول قائم کرنا۔

5۔ انقلابی صنعتی اصلاحات کا نفاذ۔ مزدور کی کم از کم اجرت تیس ہزار روپے مقرر کرنا اور مزدوروں کی فلاح و بہبود کی آئینی ضمانت۔

6۔ سامراجی گلوبلائزیشن نجکاری ٹھیکیداری اور سامراجیت کی ہر شکل کے خلاف جدوجہد کرنا۔

7۔ مذہبی انتہا پسندی، عدم برداشت اور دہشت گردی کے خلاف جدوجہد اور مذہب کو ریاست و سیاست سے الگ کرنے کے اصول پر سیکولر سماج ریاست اور سیاست کی تشکیل

8۔ مردکی بالادستی پر مبنی تمام معاشی سماجی ثقافتی اور ریاستی ڈھانچوں کا خاتمہ اور صنفی مساوات کا قیام اور عورت پر تشدد اور قدامت پرست ثقافتی یلغار کا خاتمہ۔

9۔ ملک میں بسنے والی تمام قوموں کی برابری اور معاشی سماجی و سیاسی ترقی کے لیے ان کا تمام تر معاشی وسائل پر حق آئینی طور پر تسلیم کرنا

10۔ طبقاتی نظام تعلیم کا خاتمہ اور تمام شہریوں کو تعلیم علاج روزگار اور رہائش کی آئینی ضمانت

11۔ حقیقی معنوں میں ایک مثبت اور غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی، پڑوسی ملکوں کے ساتھ دوستانہ معاشی و سیاسی تعلقات قائم کرنا اور ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا خاتمہ۔

اس سے پہلے مشاورتی اجلاس کے فیصلوں کی روشنی میں مستقبل کا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے گا اور ہر پارٹی سے درخواست ہے کہ اپنے دو رہنماؤں کے ساتھ اجلاس میں شریک ہوکر شکریہ کا موقع دیں۔

آپ کا ساتھی اختر حسین

جنرل سیکریٹری عوامی ورکرز پارٹی 03008228031

عوامی جمہوریت کے قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اپنی آراء اور تنقید سے ہمیں آگاہ کریں تاکہ ہم اپنے پرچے کے معیار کو بہتر سے بہتر کرسکیں اس سلسلے میں ہماری کوشش ہوگی کہ اس مقصد کے لیے چند صفحات مختص کرسکیں جس میں ہم صرف قارئین کی آراء کو شامل کریں گے۔ آج اس سلسلے ہم اپنے ایک قاری محترم رانا رضوی کی رائے شامل کررہے ہیں جنھوں نے ہمیں کینیڈا سے مخاطب کیا ہے انہوں نے عوامی جمہوریت کو پسند کیا اور درخواست کی کہ وہ اپنے والد کی شاعری پرچے میں اشاعت کے لیے ارسال کرنا چاہتے ہیں۔ جناب رضوی صاحب آپ کی تعریف کا شکریہ ہمیں آپ کے والد صاحب کی شاعری موصول ہوگئی ہے جو مناسب موقع پر شائع کردی جائے گی۔

پریس کانفرنس۔ لاہور پریس کلب 29 دسمبر 2017

ترقی پسند سیاسی جماعتوں کا پاکستان میں بائیں بازو کا ایک نیا متحدہ محاذ بنانے پر اتفاق

لاہور میں منعقدہ اجلاس میں 10 سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کی شرکت

پاکستان کی دس ترقی پسند اور بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کی قیادت کا ایک مشترکہ اجلاس آج لاہور میں منعقد ہوا جس میں اتفاق کیا گیا کہ پاکستان کے بائیں بازو اور قوم پرست ترقی پسند سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کا ایک متحدہ محاذ تشکیل دیا جائے گا۔ محاذ کی تشکیل کے لیے ایک آٹھ رکنی کمیٹی منتخب کی گئی کمیٹی کے ممبران میں اختر حسین، تیمور الرحمٰن، امان اللہ شیخ، امداد قاضی، شوکت چوہدری، اویس قرنی، نثار شاہ ار خالق جونیجو شامل ہیں۔ اجلاس میں شریک ہونے والی سیاسی جماعتوں میں عوامی ورکرز پارٹی، پاکستان مزدور کسان پارٹی، عوامی جمہوری پارٹی، جئے سندھ محاذ، جموں وکشمیر پیپلز نیشنل پارٹی، بلوچستان نیشنل موومنٹ، پاکستان ٹریڈ یونینز ڈیفنس کمپین، پاکستان مزدور محاذ، جموں کشمیر عوامی ورکرز پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان شامل تھیں۔ یہ اجلاس عوامی ورکرز پارٹی کی دعوت پر منعقد ہوا تھا اجلاس میں مطالبہ کیا گیا کہ ملک بھر میں جبری گمشدگیوں کا سلسلہ فوری بند کیا جائے اور لا پتہ افراد کو عدالتوں میں پیش کیا جائے بیرون ملک سے آنے والی غیر قانونی آبادی کے سلسلے کو بند کیا جائے اور غیر قانونی غیر ملکی باشندوں کو ان کے ملک واپس بھیجنے کا بندوبست کیا جائے۔ زبردستی مذہب تبدیل کر کے معصوم عورتوں اور بچیوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا سلسلہ بند کیا جائے۔ شوگر مل مافیا کے خلاف کاروائی کی جائے اور حکومتی طے شدہ ریٹس پر کاشتکاروں سے گنے کی خریداری کو یقینی بنایا جائے۔ خیبر پختونخوا میں مزارعین اور کاشتکاروں سے زمین کی کاشت کا چھینا گیا وراثتی حق واپس کیا جائے اور ان کی بے دخلیاں بند کی جائیں۔ ہشت نگر کے کسانوں پر مقدمات ختم کیے جائیں اور ان کو رہا کر کے زمینیں ان کے نام کی جائیں۔ انجمن مزارعین پنجاب کے گرفتار رہنماؤں کو فوری رہا کیا جائے اور ان کے خلاف مقدمات واپس لے کر پبلک سیکٹر زرعی فارموں کی تمام زمین مزارعین کے نام کی جائے۔ طلبا یونینز کو فوری بحال کیا جائے۔ پارلیمنٹ کی طرف سے منظور شدہ انتخابی اصطلاحات کو رد کرتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ ورکرز پارٹی کی پٹیشن پر سپریم کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں عمل درآمد کیا جائے۔

اجلاس میں پاکستان کی موجودہ معاشی وسیاسی صورت حال پر بحث مباحثہ کے بعد اتفاق ہوا کہ پاکستان کے حکمران طبقات کی سیاسی پارٹیاں ملک میں بڑھتے ہوئے معاشی وسماجی بحران کا حل پیش کرنے میں ناکام ہوچکی ہیں وہ محض ایک دوسرے پر کرپشن کا الزام لگانے کے علاوہ کوئی معاشی اور سماجی حل پیش نہیں کرتیں ہمارے نقطہ نظر سے کرپشن سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ اور لازمی جز ہے جن کا متبادل پیش کرنے کی ضرورت ہے اور وہ متبادل سوشلسٹ نظام ہی ہے۔ پاکستان میں آج بھی بڑے زمیندرانہ اور جاگیری باقیات کے نظام میں ملک کی ۶۵ فیصد آبادی پس رہی ہے۔ سامراج کے نیو ورلڈ آرڈر اور ان کے اداروں نے ہماری صنعتی ترقی اور معاشی آزادی کا گلا دبا ہوا ہے۔ محنت کش عوام اس سے گلو خلاصی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ سامراج اور حکمران طبقات کی سوچی سمجھی پالیسی کے تحت مذہب کو سماجی تبدیلی کی قوتوں کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے جس سے فرقہ وارایت، عدم برداشت اور دہشت گردی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ پاکستان ایک رضا کارانہ وفاق کی بجائے ایک مرکزیت پسند ریاست بن چکی ہے جس میں ملک بنانے والی قوموں کے ساتھ نو آبادیاتی سلوک کیا جا رہا ہے لہذا اہم مندرجہ ذیل اصولوں پر اتفاق کرتے ہوئے جدوجہد کا اعلان کرتے ہیں۔

ا۔ پاکستان کے مزدوروں، کسانوں اور محنت کش عوام کے طبقاتی مفادات کے لیے جدوجہد، جاگیرداری، سرمایہ داری نظام، مذہبی جنونیت اور سامراجی بالادستی کا خاتمہ۔

۲۔ عوامی جمہوریت کی جدوجہد جس میں پارلیمنٹ کی حقیقی بالادستی کرانے اور نیشنل سیکوریٹی اسٹیٹ کے تصور کا خاتمہ، پاکستان کو کثیر القومی ملک اور ۱۹۴۰ء کی قرارداد کے مطابق مساوی حقوق اور ان کے معاشی وسائل پر ان ہی کے اختیار کو یقینی بنانا، جنسی برابری اور غیر مسلم آبادی کے حقوق کا تحفظ۔

۳۔ مذہبی انتہاپسندی عدم برداشت اور دہشت گردی کے خلاف جدوجہد اور مذہب کو ریاست وسیاست سے الگ کرنے کے اصول پر سیکولر سماج و ریاست اور سیاست کی تشکیل

۴۔ سوشلسٹ معیشت وسماج کا قیام، طبقاتی نظام تعلیم کا خاتمہ اور سائنسی بنیادوں پر تشکیل تمام شہریوں کو تعلیم، علاج، روزگار اور رہائش کی آئینی ضمانت۔

۵۔ حقیقی معنوں میں ایک مثبت اور غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی، پڑوسی ملکوں کے ساتھ دوستانہ معاشی وسیاسی تعلقات قائم کرنا اور ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا خاتمہ۔

اختر حسین جنرل سیکریٹری عوامی ورکرز پارٹی 03008228031

فاروق طارق ترجمان عوامی ورکرز پارٹی 0300-8411945

awamiworkers@gmail.com

ایک نظر

(اس عنوان کے تحت ہم عوامی ورکرز پارٹی کی ملک بھر میں جاری سیاسی وسماجی سرگرمیوں کا جائزہ لیں گے)

ترتیب وتدوین: عابد شکیل فاروقی

لیڈز ۔ ممتاز ترقی پسند مصنف، دانشور اور مانچسٹر کی ممتاز سیاسی وسماجی شخصیت ذاکر حسین ایڈووکیٹ نے عوامی ورکرز پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی ہے، ذاکر حسین نے ملک میں استحصال اور جبر پر مبنی جاگیرداری، سرداری اور لوٹ کھسوٹ پر مبنی نام نہاد سرمایہ داری نظام اور کینسر کی طرح پھیلتی ہوئی مذہبی انتہا پسندی، دہشت گردی کے خلاف بھرپور جدوجہد کے عزم کا اعادہ کیا ہے ۔ عوامی ورکرز پارٹی نارتھ برطانیہ کے رہنماؤں نے ذاکر حسین ایڈووکیٹ کی پارٹی میں شمولیت کا زبردست خیر مقدم کرتے ہوئے ان کے قائدانہ کردار کی بدولت ملک سے استحصال پر مبنی سیاسی، سماجی، اور معاشی ڈھانچے کے خاتمے اور سماجی انصاف پر مبنی نظام کی تشکیل کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کرنے کی امید ظاہر کی ہے۔

ذاکر حسین نے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز زمانہ طالبعلمی میں کیا جب پاکستان پر ضیاء الحق کی ڈکٹیٹر شپ نافذ تھی۔ وہ ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے مرکزی رہنما رہے اور کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے ۔ مارشل لاء کے خلاف طلبہ تنظیموں کا پاکستان پروگریسو اسٹوڈنٹس الائنس بنانے میں اہم کردار ادا کیا جسمیں نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور سوشلسٹ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن بھی شامل تھیں ۔ وہ پاکستان کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے مزدوروں کو اکٹھا کرنے کے لیے کوشاں رہے ۔ ذاکر حسین ہمیشہ ہی پاکستان بالخصوص خیبر پختون خواہ محنت کشوں اور ترقی پسند سیاسی کارکنوں کے ساتھ وابستہ رہے ۔ عوامی ورکرز پارٹی پاکستان کے مرکزی رہنماؤں عابد حسن منٹو، فانوس گجر، اختر حسین ایڈووکیٹ، عابدہ چوہدری، یوسف مستی خان، عصمت شاہجہاں، شہاب خٹک، حیدر زمان، کفایت اللہ اور پروفیسر شاہجہان نے ذاکر حسین کی پارٹی میں شمولیت کا زبردست خیر مقدم کیا ہے اور مستقبل میں ان کے سرگرم کردار کی توقع ظاہر کی ہے ۔ (پرویز فتح) ☆ عوامی ورکرز پارٹی کراچی کے زیر اہتمام Comparative analysis of class theories کے موضوع پر 9 دسمبر کو ایک تربیتی نشست کا انعقاد کیا گیا، نشست پارٹی کے مرکزی سیکریٹریٹ میں منعقد ہوئی جسمیں پارٹی کارکنان اور نوجوانوں نے شرکت کی ۔ ☆ عوامی ورکرز پارٹی سانگھڑ کے دفتر میں 18 نومبر، مزدوروں کے مسائل پر، ایک نمائندہ اجلاس کا انعقاد ہوا، اجلاس میں چیمبر آف کامرس کے رہنما حاجی یامین بھی موجود تھے، جسمیں ضلعی لیبر سیکریٹری محبوب علی، اور میر حسن مری نے مزدوروں سے ان کے مسائل پر گفتگو کی اور اس سلسلے میں حکمت عملی کے لئے آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا۔ ☆ 21 نومبر کو قمبر پریس کلب کے سامنے اور لاڑکانہ میں سندھ پروگریسو کمیٹی کی جانب سے زرعی اجناس کی کم قیمتوں کے خلاف ایک احتجاجی مظاہرہ کیا گیا جسمیں عوامی ورکرز پارٹی نے بھی شرکت کی ۔ ☆ عوامی ورکرز پارٹی سوات کا ایک اہم اجلاس 26 نومبر، زیر صدارت کامریڈ فانوس گجر، صدر عوامی ورکرز پارٹی، میر انعام اللہ خان کے حجرے میں منعقد ہوا اجلاس میں سوات کی سات تحصیلوں سے 35 رکنی ضلعی کمیٹی کا انتخاب کیا گیا، اجلاس میں پارٹی کی ضلعی سطح پر مستقبل کی سیاسی سرگرمیوں کے لئے حکمت عملی طے کی گئی، اجلاس سے پارٹی کے رہنماؤں عبدالہادی استاد، عبدالجلال کاکا جی، صوبائی نائب صدر حاجی محمد امین، ضلعی صدر حاجی شیر رحمٰن، جنرل سیکریٹری صوفی صیب میاں زیب شاہ باچا، طالوت، فایون احد، ضیاء الرحمٰن اور موسیٰ خان نے خطاب کیا۔ ☆ عوامی ورکرز پارٹی خیبر پختون خواہ کے زیر اہتمام 10 نومبر کو نوشہرہ میں بالشوک انقلاب کی سو سال مکمل ہونے پر تقریب کا انعقاد کیا گیا، جسمیں صوبے بھر سے پارٹی کارکنوں اور سیاسی ہمدردوں کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی، تقریب سے پارٹی کے سابق اور بانی صدر محترم عابد حسن منٹو، مرکزی صدر اور جنرل سیکریٹی کامریڈ فانوس گجر اور کامریڈ اختر حسین، مرکزی سینئر نائب صدر محترم یوسف مستی خان ڈپٹی جنرل سیکریٹری، کامریڈ عصمت شاہجہاں، پارٹی ترجمان کامریڈ فاروق طارق، پنجاب اور خیبر پختون خواہ قومی اکائیوں کے صدور کامریڈ عاصم سجاد اور کامریڈ شہاب خٹک، کے علاوہ دیگر مرکزی وصوبائی رہنماؤں نے خطاب کیا۔ ☆ عوامی ورکرز پارٹی بادھ کے زیر اہتمام 10 نومبر کو بالشوک انقلاب کی سو سال اور داس کیپیٹل کے ڈیڑھ سو سال مکمل ہونے کی مناسبت سے ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا، سیمنار کی صدارت پارٹی کے صوبائی نائب صدر کامریڈ اثر امام نے کی، جسمیں انکے علاوہ ضلعی لاڑکانہ کے صدر کامریڈ ذوالفقار بروہی اور نائب صدر کامریڈ مجیب پیرزادہ نے خطاب کیا۔ سیمنار میں ضلع بھر سے پارٹی کارکنان اور شہر کے دیگر سیاسی وسماجی کارکنان نے کثیر تعداد میں شرکت کی ، سیمنار میں شرکاء سے گفتگو کے لئے مقررین کو تین الگ الگ موضوعات تفویض کئے گئے تھے، کامریڈ اثر امام نے ''اکتوبر انقلاب اور قومی سوال'' پر سیمنار کے شرکاء سے گفتگو کی، انہوں نے کہا کہ قوم کا جدید تصور مغربی معاشروں میں سرمایہ دارانہ نظام کے ارتقاء اور خصوصاً صنعتی ترقی کے ابھار کے دوران ابھرا حقیقت تو یہ ہے کہ قوم اور قومیت سے جڑے ہوئے سارے جھگڑے بنیادی طور پر معاشی سوال سے جڑے ہیں، اس سوال کا حل سرمایہ داری پاس نہیں تھا سو وہ نہیں دے پائی، روسی بالشوک پارٹی نے محکوم اقوام کی حقوق کی محض زبانی جمع خرچ کے طور پر حمایت نہیں کی تھی بلکہ اس پر عملدرآمد کر کے بھی دکھایا۔ سیمینار سے لاڑکانہ کے صدر کامریڈ ذوالفقار بروہی نے ''سوویت دور کی سماجی وثقافتی ترقی'' پر گفتگو کی، انہوں نے کہا کہ اکتوبر انقلاب نے انسانیت کی ثقافتی اور تہذیبی ترقی میں بڑا کردار ادا کیا خصوصاً علم، ادب، اور فن کے میدان میں روسی عالموں، ادیبوں اور ہنرمندوں نے کمال کر دکھایا۔ کامریڈ مجیب پیرزادہ نے ''اکتوبر انقلاب کامیابیاں کمزوریاں اور رد انقلاب کے اسباب'' پر سیمنار سے خطاب کیا، انہوں نے کہا کہ اکتوبر انقلاب کو رد انقلاب کا شکار کہنے والے گم گشتہ راہ ہیں، یہ ایک تسلسل ہے جسمیں کبھی دشمن فتح یاب ہوتا ہے جبکہ حتمی فتح سچ کی ہی ہوتی ہے جسکے لئے انقلاب کی خوبیوں اور کمزوریوں کو گہرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے ، شرکاء نے سیمنار کے آخر میں مختلف سیاسی، معاشی اور علاقائی مسائل پر قرار دادیں منظور کیں (سلیم نوناری)۔ ☆ عوامی ورکرز پارٹی حیدرآباد کی زیر اہتمام، کراچی میں کسانوں اور ہاریوں کے احتجاجی مظاہرے پر پولیس کے بہیمانہ تشدد کے خلاف، 16 دسمبر کو ایک مظاہرہ کیا گیا جسمیں مطالبہ کیا گیا کہ گنے کے کاشتکاروں کو سرکاری نرخ پر گنے کی فصل کی ادائیگی کر کے شوگر مل مالکان کو ملوں کو چلانے کی ہدایت کی جائے ☆ عوامی ورکرز پارٹی بلوچستان کے زیر اہتمام، بیت المقدس، کو اسرائیلی کے دارالحکومت کے طور پر تسلیم کرنے کے امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے متنازعہ بیان کے خلاف کوئٹہ پریس کلب کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کیا گیا، مظاہرین سے خطاب

کرتے ہوئے عوامی ورکرز پارٹی بلوچستان کے صدر محمد یوسف کاکڑ نے کہا کہ یروشلم کی حیثیت کے تعین کے مسئلے کو ان کی پارٹی فلسطینی عوام کی جدوجہد آزادی سے جڑا ہوا تصور کرتی ہے، اور یہ مسئلہ صرف فلسطین کا مسئلہ حل ہونے کے ساتھ ہی حل ہوسکتا ہے انہوں نے مزید کہا کہ امریکی حکمرانوں کی سامراجی حکمت عملی نے مشرق وسطی کو ایک نئے بحران سے دوچار کرنے کے علاوہ، عالمی امن کو خطرے میں ڈال دیا ہے، اس موقع پر پارٹی کے سینئر نائب صدر عبدالستار بلوچ نے اپنی پارٹی کی سامراج مخالف پالیسی پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اے ڈبلیو پی خطے میں عدم استحکام پیدا کرنے کی امریکی سازشوں کی ڈٹ کر مخالفت کرتی رہے گی۔ مظاہرین نے، امریکی پالیسیوں کے خلاف بینرز اٹھا رکھے تھے اور فلسطینیوں کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ (رپورٹ: عمران محمد حسنی) ☆ عوامی ورکرز پارٹی بلوچستان کے زیر اہتمام، پارٹی Mass Line کے موضوع پر ایک تربیتی نشست منعقد کی گئی، نشست سے پارٹی کے مرکزی سیکریٹری تعلیم وتربیت نے خطاب کیا انکے خطاب کے بعد سوال جواب کا سیشن بھی ہوا، نشست میں مختلف ساتھیوں نے عوامی لائین اور طبقاتی جدوجہد کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت کی۔ ☆ محنت کش عوام کے عظیم انقلابی رہنما کامریڈ حسن ناصر شہید کی برسی پر عوامی ورکرز پارٹی (گلشن اقبال یونٹ) کراچی کے زیر اہتمام، 2 دسمبر کو پارٹی کے مرکزی سیکریٹریٹ میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا، تقریب کی صدارت عوامی ورکرز پارٹی (نیو کراچی یونٹ) کے صدر اور پارٹی کے بزرگ کارکن کامریڈ عزیز احمد خان نے کی' تقریب میں کراچی پارٹی کے ذمہ داروں اور کارکنوں کی کثیر تعداد کے علاوہ شہید حسن ناصر کی خدمات اور عظیم قربانی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے، پارٹی کے صوبائی نائب صدر کامریڈ اثر امام، پروفیسر توصیف احمد، ڈی ایس ایف کے مرکزی سیکریٹری ثاقب ڈومکی، این ایس ایف کے خرم نیر اور شہید حسن ناصر کی جدوجہد کے ساتھی محترم اقبال علوی نے خصوصی شرکت کی، جنہوں نے کامریڈ کی زندگی کے حالات اور انکی جدوجہد سے شرکاء کو آگاہ کیا۔ (رپورٹ: امر عزیزی)۔ ☆ سوات اور مالاکنڈ سے تعلق رکھنے والے کسانوں اور کاشتکاروں کی تنظیم اسمال فارمرز آرگنائزیشن اور عوامی ورکرز پارٹی خیبر پختون خوا نے 19 دسمبر کو، سوات سے صوبائی اسمبلی بلڈنگ پشاور تک مشترکہ طور پر ایک لانگ مارچ کا اہتمام کیا، مارچ میں سینکڑوں کی تعداد میں مظاہرین نے شرکت کی، انہوں نے اپنے مطالبات کی منظوری کے نعرے لگاتے ہوئے مطالبہ کیا کہ چھوٹے کاشتکاروں کی جبری بیدخلی روکی جائے، اور ریاست کی جانب سے زرعی اور جنگلات کی زمین زبردستی قبضے کی کوششوں کو روکا جائے، مارچ میں شامل مظاہرین نے صوبائی حکومت سے مزید مطالبہ کیا کہ نام نہاد ''بلین ٹری پروجیکٹ'' کے نام پر کسانوں اور چھوٹے کاشتکاروں کے استحصال کو فوراً روکا جائے، مظاہرین نے اس پروجیکٹ کو ان کی زمینوں پر ناجائز قبضوں کی پالیسی قرار دیا۔ ☆ سندھ پروگریسو کمیٹی کے زیر اہتمام، 23 دسمبر کو کراچی پریس کلب پر، سندھ میں لاپتہ افراد کی بازیابی اور یکجہتی کی خاطر ایک علامتی بھوک ہڑتال کی گئی، جسمیں عوامی ورکرز پارٹی کی جانب سے پارٹی کے جنرل سیکریٹری اختر حسین اور پارٹی کے صوبائی صدر بخشل تھلو نے حصہ لیا، بھوک ہڑتال کے موقع پر شہر کی ترقی پسند جمہوری اور انسانی حقوق کی جدوجہد کرنے والی قوتوں نے، ہڑتالی کارکنوں سے یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔ ☆ عوامی ورکرز پارٹی بادھ کی جانب سے 24 دسمبر کو پندرہ روزہ حسن ناصر اسٹڈی سرکل پارٹی آفس میں منعقد کیا گیا جسمیں نوجوان ساتھی کامریڈ بابر سومرو نے جمہوریت کیا ہے اور اسکی پاکستان میں کیا حیثیت ہے پر بات کی۔ ☆ اسلام آباد کی نواحی بستی میرابادی F-12 کی غوثیہ کالونی میں 24 دسمبر کو عوامی ورکرز پارٹی کا ایک اجلاس منعقد ہوا، جسمیں غوثیہ کالونی میں پارٹی کا ایک نئے یونٹ کا افتتاح کرتے ہوئے پارٹی رہنما پروفیسر شاہجہان اور کامریڈ منہاج نے ایک پبلک میٹنگ سے خطاب کیا، اس دوران کامریڈ عصمت نے علاقے میں ایک واٹر پروجیکٹ کا افتتاح بھی کیا، اجلاس کے دوران جناب شفیق اعوان نے پارٹی سے اپنی وابستگی کا بھی اعلان کیا۔ ☆ عوامی ورکرز پارٹی سانگھڑ کی جانب سے کراچی میں NTS ٹیچر کے اپنے مطالبات کے حق میں کئے گئے مظاہرے پر سندھ حکومت کے بہیمانہ تشدد کی شدید الفاظ میں مذمت کی ہے، پارٹی نے صوبے میں گنے کی سرکاری نرخ پر خریداری پر عملدرآمد کی ناکامی پر بھی اپنی ناراضگی کا اظہار کیا، پارٹی نے سندھ حکومت پر زور دیا کہ وہ فوری طور پر NTS ٹیچرز کے مطالبات کی منظور کرے اور گنے کے سرکاری نرخ کی پالیسی پر عملدرآمد کرے۔ ☆ عوامی ورکرز پارٹی بادھ کی جانب سے 28 دسمبر کو شہر میں ایک احتجاجی مظاہرہ کیا گیا جسمیں پارٹی کارکنان نے شہر کی سرکاری ہسپتال کے لئے ادویات کی فراہمی اور ہسپتال میں مزید میل اور فیمیل ڈاکٹرز کی تعیناتی کا مطالبہ کیا گیا۔ ☆ 29 دسمبر 2017 عوامی ورکرز پارٹی ضلع سکھر کے انتخابات، پارٹی کے صوبائی نائب صدر کامریڈ اثر امام کی نگرانی میں منعقد ہوئے جسمیں لیاقت منصور عباسی صدر، نین سکھانی سینئر نائب صدر، عتیق سومرو جنرل سیکریٹری، ضیاء بھٹی جوائنٹ سیکریٹری اور دیگر عہدداروں کا انتخاب کیا گیا۔ ☆ سندھی ادبی سنگھت سانگھڑ کی جانب سے مورخہ 30 دسمبر 2017 کو ایک لیکچر کا انعقاد کیا گیا جسمیں عوامی ورکرز پارٹی سندھ کے نائب صدر کامریڈ اثر امام نے ''سماج میں ادیب کا کردار'' کے موضوع پر شرکاء سے گفتگو کی۔ ☆ عوامی ورکرز پارٹی ضلع لاڑکانہ کی جانب سے 31 دسمبر 2017 کو نصیر آباد میں دو حصوں پر مشتمل کامریڈ حیدر بخش جتوئی سوشلسٹ اسکول کا انعقاد کیا گیا، پروگرام کے پہلے حصے میں حیدرآباد پارٹی کے کامریڈ ادیب راتڑ نے ماحولیاتی سوال پر، عوامی ورکرز پارٹی پنجاب کی ڈپٹی جنرل سیکریٹری کامریڈ عالیہ امیر علی نے صنفی سوال پر، عوامی ورکرز پارٹی سندھ کے سیکریٹری تعلیم وتربیت کامریڈ جاوید راجپر نے عالمی سیاسی صورتحال اور سوشلزم پر بات کی، جبکہ پروگرام کے دوسرے حصے میں کامریڈ شفقت قادری نے ''سندھ کو کونسے ادب کی ضرورت ہے'' پر، عوامی ورکرز پارٹی کی مرکزی ڈپٹی جنرل سیکریٹری کامریڈ عصمت شاہجہاں نے ''قومی سوال اور ہمارا سیاسی ونظریاتی حصے'' پر، جبکہ پارٹی کے پنجاب اکائی کے صدر کامریڈ عاصم سجاد نے ''مارکسزم کیا ہے'' پر اسکول کے شرکا سے گفتگو کی، پروگرام میں لاڑکانہ اور نصیر آباد سے عوام بالخصوص خواتین اور بچوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی' پروگرام کے اختتام پر عوامی ورکرزز پارٹی سندھ کے صدر کامریڈ بخشل تھلو نے پروگرام میں شرکت کرنے والے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا انہوں نے اپنے مختصر خطاب میں کارکنوں پر عوامی اور مزاحمتی سیاست کی جدوجہد کو تیز کرنے پر پر زور دیا۔

O